....اور بجوکا ننگا ہوگیا!
عبدالعزیز خان

...اور بجو کا ننگا ہو گیا!

کہانیاں

عبدالعزیز خان

خان پبلی کیشنز، ممبئی

نام کتاب	:	...اور بجوکا ننگا ہوگیا!
مصنف	:	عبدالعزیز خان
اشاعت	:	ستمبر ۲۰۰۸ء
قیمت	:	-/200 روپے
بیرونِ ممالک	:	۱۰ ر یو ایس. ڈالر
سرورق	:	اوم راجپوت

کمپوزنگ اور طباعت

ناشر

خان پبلی کیشنز، امین بلڈنگ، چوتھا منزلہ، فلیٹ نمبر ۲۱، ای. آر. روڈ، ممبئی-۳ فون: 23743781

ملنے کے پتے

کتاب دار، ۱۰۸/۱۱۰، جلال منزل، گراؤنڈ فلور، ٹیمکر اسٹریٹ، ممبئی-۸ فون: 23411854

مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ: دہلی، علی گڑھ اور [ممبئی برانچ] پرنس بلڈنگ، ای. آر. روڈ ممبئی-۳ فون: 23774857

نئی کتاب پبلشرز، ڈی-۲۴، ابوالفضل انکلیو، پارٹ ۱، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵ فون: 011-65416661

... Aur Bijuka Nanga Ho Gaya! (Collection of 21 Urdu Short Stories)
By: Abdul Aziz Khan
Price : 200/- (Foreign Countries 10 US $)
Published by : **Khan Publications**
4/21, Amin Bldg., E. R. Rd., Mumbai - 400 003. Tel. 23743781

اعزازی کتابیں :

’’روٹی کے لئے پیسے نہیں ہیں تو اعزازی کتابیں کب کام آئیں گی، انہیں ردّی والے کو بیچ دو!‘‘

یک سطری کہانی

عبدالعزیز خان

ترتیب

انتساب

انقلاب	اردو ٹائمز	ہندوستان
نیا ورق	شاعر	نئی کتاب
کتاب نما	روشنائی	ایوانِ اردو
بے باک	ذہنِ جدید	سب رس

دی سنڈے انڈین

کہانی کار اپنے فلیٹ میں پہنچا۔ اوپر سے پھر نیچے کا نظارہ کیا، وہ شخص آرام سے سویا تھا۔ اس کی کپکپاہٹ تھم گئی تھی۔ کہانی کار مطمئن ہوکر سونے چلا گیا۔ لیکن وہ دیر تک سو نہ پایا۔ اسے اپنے بچپن میں پڑھی ایک کہانی بار بار یاد آتی رہی۔ جس میں ایک غریب بچہ دن بھر بھیک مانگتا ہے اور کوئی اسے بھیک نہیں دیتا تو وہ بھوکے پیٹ سو جاتا ہے۔ سردی کے دن ہیں۔ رات میں برف باری ہوتی ہے اور قدرت ایک برف کی چادر سے سوئے ہوئے بچے کو ڈھک دیتی ہے۔ کہانی کار سوچنے لگا کیا اس شخص کا بھی یہی حال ہوگا؟

(..... بلینکیٹ، ص ۳۰)

بینڈ اسٹینڈ کی ایک شام

ولیم کی ماں مسز گومس اور مسز کولاسو سینٹ اینڈ ریوز روڈ پر ایک ہی عمارت میں برسوں سے رہا کرتی تھیں۔ ان کا معمول تھا کہ وہ شام ۵ بجے گھر سے نکلتیں۔ چم بائی (Chimbai) کے نام سے مشہور علاقے (جو مچھیروں کے کسی گاؤں کا سا تھا) میں رہنے والوں اور سودا فروخت کرنے والوں سے ملتیں۔ ان کے بال بچوں کی خیریت پوچھتیں۔ ہل روڈ پر آ جاتیں۔

محبوب اسٹوڈیو کو محیط دیوار کی خستہ حالت اور ٹریفک کی گہما گہمی پر تبصرہ کرتیں اور ماؤنٹ میری کے راستے چرچ کی جانب آہستہ قدموں سے چلنے لگتیں۔

یہ دونوں ذیابطیس کے مرض میں مبتلا تھیں اور ان دونوں کو ڈاکٹر نے بلا ناغہ چہل قدمی کا مشورہ دے رکھا تھا۔ چرچ کے احاطے میں داخل ہونے سے پہلے مسز گومس نے دو موم بتیاں خریدیں۔ ایک انہوں نے میڈونا کے طاق میں اور دوسری سینٹ پال کے طاق میں روشن کر کے رکھ دیں۔

بچپن ہی سے مسز گومس پر عبادت کے کلمات کا ورد کرتے ہوئے لرزہ طاری ہو جایا کرتا تھا۔ وہ یسوع پر کیے گئے مصائب اور ان کو پہنچائی گئی ایذاؤں کا تصور کرتیں۔ پھر اپنے اطراف اور اس دنیا میں ہونے والے جرائم اور گناہ کا یسوع کو پہنچائی گئی تکلیفوں سے موازنہ کرتیں اور یسوع کے ان الفاظ کو یاد کر کے روتیں۔

''اے میرے خدا! انہیں نہیں معلوم کہ وہ کیا کر رہے ہیں، تُو اُنہیں ان کے گناہوں سے بخش دے۔''

چرچ سے نکل کر وہ اس ڈھلوان راستے پر آ گئی تھیں جو بینڈ اسٹینڈ کی ساحلی سڑک سے آگے جا کر مل جاتا تھا۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ شفق اُفق کو اپنی سرخی سے گرما رہی تھی۔ ستمبر کی ہواؤں میں گزرتے ہوئے موسمِ باراں کی کسی قدر خنک مگر مسحور کن کیفیتیں پنہاں تھیں۔ مسز گومس نے ''پوژاں'' سینٹ لگا رکھا تھا جس کی شیشی دیگر مصنوعات کے ساتھ ان کے خاوند نے پچھلے دنوں جنیوا سے بھجوائی تھی غالباً اسی خوشبو کی سرگوشیاں سننے کے لئے مسز کولاسو اُن کے ایک قدم پیچھے چل رہی تھیں۔

وہ اتوار کا دن تھا اور باندرہ بینڈ اسٹینڈ پر حسبِ معمول میلا لگا ہوا تھا۔ ایک بوڑھا جاگنگ کر رہا تھا۔ ایک آیا چھوٹے بچے کو بچہ گاڑی میں ہوا خوری کے لئے لائی تھی۔ ایک طرف سیٹھانیاں سی نظر آنے والی کچھ عورتیں بینچ پر پاؤں پھیلائے بیٹھی خوش گپیاں کر رہی تھیں، جوڑے ایک دوسرے کی آغوش میں رومانی خیالوں میں گم تھے اور ذرا دور ''سی راک ہوٹل'' کسی چٹان کی طرح کھڑا تھا۔ پر اجاڑ اجاڑ سا۔ اس کے سامنے ہی بنے ہوٹل تاج لینڈز اینڈ Taj Land's End نے اس کی ساری رونقیں اپنے اندر جذب کر لی تھیں۔

شام گہری ہو رہی تھی۔

اکرم اور اینتھنی، سوہن کو چھیڑ رہے تھے۔

''دیکھو یار! میں بہت پریشان ہوں، مجھے اور پریشان مت کرو۔'' سوہن نے جھلّا کر کہا۔

اینتھنی نے فقرہ کسا:

''کیا بات ہے؟ ضرور کسی لڑکی کا چکّر ہوگا۔''

''نہیں یار! تجھے تو ہر جگہ لڑکی ہی نظر آتی ہے، دراصل میں ڈیڈی کی وجہ سے پریشان ہوں۔'' سوہن نے کہا۔

اکرم نے پوچھا:

''آخر بات کیا ہے؟ کچھ بولے گا بھی۔''

''ڈیڈی جس کمپنی میں کام کرتی ہے، وہاں دو لاکھ کا غبن ہو گیا ہے۔ کمپنی نے ہر ایک ملازم کو ۲۰ ہزار کی بھرپائی کرنے کو کہا ہے ورنہ اُسے نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے گا یا پھر اُس پر غبن کا الزام

تھوپ دیا جائے گا۔ ہم بینڈ ٹو ماؤتھ جینے والے لوگ ہیں، کہاں سے اتنا پیسہ لائیں گے۔''
''دیکھ یار! تو اپنا آدرش وادی نقاب اتار دے تو لاکھوں کمائے گا، میرے پلان پر چلے گا تو راتوں رات پیسوں میں کھیلے گا، بول تیار ہے؟'' اینتھنی نے پوچھا۔
''یار! کچھ بھی کرا ینتھنی، دیدی نے ہم بہن بھائیوں کے لئے اپنی زندگی تج دی، اپنی شادی کا بھی نہیں سوچا۔ اب ان پر مصیبت آئی ہے تو میں اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر بھی رقم حاصل کروں گا، تو جو بولے گا وہی کروں گا۔'' سوہن نے خود سپردگی کا اظہار کر دیا۔

بینڈ اسٹینڈ پر ایک طرف ٹین ایجرز کا جمگھٹا ہے تو دوسری طرف طرح طرح کا مال بیچنے والے ہاکرز کا۔ ادھر اُدھر کے بینچوں پر گرد اور چرس پینے والے گردی اور چرسی بھی بیٹھے ہوئے ہیں، بیچ سڑک پر کرکٹ بھی چل رہا ہے، ساحل کی چٹانوں پر بیٹھے جوڑے اپنے آپ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کسی کو کرکٹ کا بال سر پر لگ گیا، وہ جھگڑا کر رہا ہے، گالی گلوچ جاری ہے۔
وہیں ایک بُڑھیا امرود بیچ رہی تھی، ایک دس سال کا لڑکا جس نے پھٹی ہوئی بنیان اور نیکر پہن رکھی تھی، ایک ٹوکری لے کر قریب آیا اور اس کی بغل میں بیٹھ گیا، ٹوکری میں امرود تھے۔
بُڑھیا زور سے چلائی:
''اے چل! ٹوکری یہاں سے اٹھا۔''
وہ ایک بھدّی اور بدصورت بُڑھیا تھی اور اس کی آواز بے حد سخت تھی۔ پھٹی بنیان اور نیکر والا لڑکا بولا:
''یہ بینڈ اسٹینڈ ہے۔ یہاں ہر کوئی اپنا مال بیچ سکتا ہے، دیکھ چاروں طرف ہاکرز اپنا مال بیچ رہے ہیں پھر میں یہاں کیوں نہ بیٹھوں، کیا یہ تیرے باپ کا بینڈ اسٹینڈ ہے؟''
بُڑھیا کے قریب ایک آٹھ سال کا چھوکرا اپنے سامنے ٹوکری لئے بیٹھا تھا۔ اس میں کیلے رکھے تھے۔ اس نے غصے سے پھٹی بنیان والے لڑکے کو تاکا اور بولا:
''ٹوکری اٹھاتا ہے یا نہیں؟''
پھٹی بنیان والے لڑکے نے کوئی جواب دینے سے پہلے اس لڑکے کی طرف دیکھا، وہ طاقت میں، عمر میں، قد میں چھوٹا تھا، لہٰذا اکڑ کر پھٹی بنیان والے لڑکے نے کہا:
''نہیں اٹھاؤں گا، یہیں بیٹھوں گا۔''

بس اتنا کہنا تھا کہ وہ آٹھ سال کا چھوکرا بجلی کی سی تیزی سے اٹھا، دوسرے ہی لمحے اس کی ٹانگ کی ضرب پھٹی بنیان والے لڑکے کے پیٹ پر پڑی، اور ایک مُکا وہ منہ پر مار چکا تھا اور پھٹی بنیان والا لڑکا زمین چاٹ رہا تھا۔

"اٹھا ٹوکری!" آٹھ سال کا چھوکرا تحکمانہ انداز میں بولا۔

پھٹی بنیان والا لڑکا وہاں سے آگے بڑھا تو اسے ایک اپنا ہم عمر لڑکا ایک روپے میں بال پین بیچتا نظر آیا۔

"ایک روپیہ ایک روپیہ ایک روپیہ...... بڑھیا بال پین ایک روپے میں"

پھٹی بنیان والے لڑکے نے سوچا۔ چلو اس کے پاس بیٹھتے ہیں، لیکن اسے دیکھ کر بال پین بیچنے والا لڑکا بولا:

"چل! جا یہاں سے میرا دھندا خراب مت کر۔"

پھٹی بنیان والے لڑکے نے سمجھاتے ہوئے کہا:

"دوست! تم بال پین بیچ رہے ہو، میرے پاس تو امرود ہیں۔ پھر ہمارا کیا مقابلہ؟"

لیکن وہ لڑکا تلخی سے بولا:

"معلوم ہوتا ہے بینڈ اسٹینڈ پر نیا آیا ہے ورنہ ایسی بات نہیں بولتا۔ تو نے کبھی گراک کا تھوبڑا دیکھا ہے، جانتا ہے گراک کا بھیجا ایک منٹ میں کیسے بدل جاتا ہے۔ آئے گا بال پین لینے اور چلا جائے گا امرود لے کر۔ جا بھائی جا یہاں سے بھیجا خراب مت کر نہیں تو......"

وہ کیلے بیچنے والا لڑکا اینتھنی تھا، بال پین بیچنے والا اکرم اور امرود بیچنے والا لڑکا سوہن تھا۔ اس واقعے کو پیش آئے ہوئے دس برس گزر چکے تھے مگر ان تینوں کو اس کی ایک ایک تفصیل یاد تھی۔

آج سوہن، اینتھنی اور اکرم اپنی مخصوص بینچ پر بیٹھے تھے۔ سوہن سوچ رہا تھا۔ اس مشکل کے وقت اینتھنی اور اکرم ہی اُس کے کام آئیں گے۔ ورنہ وہ کیا کرتا۔ اتنے پیسوں کا انتظام کیسے کرتا۔ غلط راستے سے بھی اگر پیسہ ملے تو کیا برا ہے۔ پیسے پر تھوڑے ہی لکھا ہوتا ہے کہ اسے صرف صحیح راستے سے حاصل کیا جائے اور پھر لوگ پیسہ دیکھتے ہیں، پیسہ کیسے آیا ہے یہ نہیں دیکھتے!

ناریل پانی پینے کے بعد اینتھنی نے سوہن سے کہا:

"ولیم کی ماں مسز گومس دوپہر میں گھر پر اکیلی رہتی ہیں۔ ولیم کا باپ سوئٹزرلینڈ میں کاروبار

کرتا ہے۔ کافی پیسہ ہے ان کے پاس، ایک ہاتھ مارنے میں کوئی حرج نہیں۔''

اکرم نے اینتھنی سے کہا:

''مگر مسز گومس ہمیں پہچانتی ہیں۔''

''جو آگے ہوگا دیکھا جائے گا، کل کی فکر مت کرو، آج کو جیو اور آج کو ہی زندگی سمجھو۔'' اینتھنی نے اکرم سے کہا۔

اکرم اور سوہن چپ ہو گئے۔

سوہن سوچنے لگا۔ دو سال پہلے دیدی آفس جا رہی تھی تو ولیم نے اسے چھیڑا تھا۔ اکرم اور اینتھنی کے ساتھ وہ بھی وہیں کھڑا تھا۔ ولیم سے اس کا جھگڑا ہوا تھا۔ ولیم نے کہا تھا:

''ارے یار! لڑکی اچھی لگی تو چھیڑ دیا۔ مجھے کیا معلوم تیری بہن ہے؟''

بہت دنوں تک یہ تلخی رات دن اس کا پیچھا کرتی رہی، لیکن بعد میں اکرم نے ولیم اور سوہن کی دوستی کرا دی تھی۔

اکرم نے کہا:

''سمندر میں سے لوٹا بھر پانی نکال لیا جائے تو سمندر کا پانی کم نہیں ہوتا۔''

اینتھنی نے کہا:

''اچھی خاصی رقم ہوگی اور ہم کامیاب ہوں گے، مگر ہر کام بڑی سوجھ بوجھ اور پلان سے کرنا ہوگا۔

ڈھلوان راستے سے اُتر کر مسز گومس اور مسز کولاسو بینڈ اسٹیڈ کی ساحلی سڑک پر آ چکی تھیں اور اب وہ دونوں اُس مخصوص بینچ کے قریب سے گزرنے لگیں جس پر سوہن، اینتھنی اور اکرم بیٹھے ہوئے تھے۔ اینتھنی انہیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا دیکھا دیکھی اکرم اور سوہن بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان تینوں نے تقریباً ایک ساتھ ''گڈ ایوینگ مسز گومس، گڈ ایوننگ مسز کولاسو'' کہا۔

جواباً مسز گومس نے کہا:

''او! مائی سویٹ سنس کیا ہوا، اپنی آنٹی کو بھول گئے یا ولیم سے ان بن ہو گئی ہے۔ آئے ہی نہیں ہمارے گھر بہت دنوں سے۔'' یہ کہہ کر مسز گومس نے شفقت بھرا ہاتھ اینتھنی کے سر پر رکھ دیا۔

''نہیں آنٹی، آج کل ہم تینوں نوکری کرتے ہیں۔ پھر ڈیوٹی سے لوٹنے کے بعد ٹائم نہیں بچتا۔ ہم ابھی بیٹھے بیٹھے آپ ہی کو یاد کر رہے تھے۔ ضرور آئیں گے۔ ولیم کیسا ہے؟ اسے ہماری

طرف سے ہلّو ضرور کہنا۔‘‘

مسز گومس نے اپنا پرس کھولا اور اس میں سے خاوند کے بھجوائے ہوئے Toblerone کے چاکلیٹ کا لمبا چوڑا پیکٹ نکال کر انہیں دیا اور کہا:

’’انجوائے مائے ڈیئر سنس اینڈ ڈونٹ فرگیٹ ٹو کم ہوم۔‘‘

یہ کہہ کر دونوں آگے بڑھ گئیں۔

دو روز بعد دوپہر میں۔

ولیم کے فلیٹ پر اکرم، سوہن اور اینتھنی پہنچے۔

اینتھنی نے کال بیل بجائی۔

ولیم کی ماں مسز گومس گھر میں اکیلی تھیں۔

آئی ہول سے دیکھ کر انہوں نے پہچانا کہ تینوں ولیم کے دوست ہیں، دروازہ کھول کر انہیں فلیٹ کے اندر بلا لیا اور دروازہ بند کر دیا۔

جیسے ہی وہ دروازہ بند کر کے پلٹیں، اینتھنی نے ان کے منہ پر ٹیپ چپکا دیا اور اکرم اور سوہن نے انہیں پکڑ کر کرسی پر زبردستی بٹھا کر رسّی سے باندھ دیا۔

اینتھنی نے ان کے کان کے بُندے اور کلائیوں کی چوڑیاں اتار لیں، گلے سے سونے کی چین کھینچ لی جس میں ہیرے کا کراس پینڈنٹ جگمگا رہا تھا اور گلے پر چاقو رکھ کر پوچھا:

’’کہاں ہے کباٹ کی چابیاں؟‘‘

خوف زدہ آنٹی نے تکیے کی طرف اشارہ کیا۔

تپائی پر پڑا ہوا موبائیل بجنے لگا۔ سارے گھر میں موبائیل کی آواز گونجنے لگی۔ لیکن کسی نے اُسے نہیں اٹھایا۔

سوہن نے تکیے کے نیچے سے چابیاں نکالیں اور تینوں کباٹ سے کیش اور زیورات نکال کر جھولے میں بھرنے لگے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں ہینڈ گلوز پہن رکھے تھے اور کسی قسم کا نشان نہیں چھوڑا تھا۔

جاتے وقت اینتھنی نے آنٹی کو دھمکی دیتے ہوئے کہا:

’’اگر پولس کو بتایا تو کاٹ کر رکھ دیں گے اور ولیم کو بھی نہیں بخشیں گے۔‘‘

مسز گومس سوچ رہی تھیں......

یہ تینوں لڑکے ولیم کے دوست ہیں، اکثر گھر آتے، شرارتیں کرتے، گیت گاتے، انتاکشری کھیلتے ہیں۔ پچھلی بار آئے تھے تو کہا تھا:

''آنٹی! ہمیں بھوک لگی ہے۔''

میں نے انہیں آملیٹ بنا کر دیا۔ آملیٹ دیکھ کر تینوں خوش ہو گئے۔ پھر تینوں نے ڈٹ کر ناشتہ کیا تھا اور چلے گئے تھے۔

وہ پچھلی باتیں سوچ رہی تھیں۔

اور تپائی پر پڑا موبائیل بج رہا تھا۔

رات کو ولیم اپنی چابی سے لیچ کھول کر فلیٹ میں داخل ہوا تو اس نے ماں کو جکڑی ہوئی حالت میں دیکھا۔ بلا ہوش و حواس کھوئے اس نے ماں کے منہ پر سے ٹیپ الگ کیا، پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کھولے۔ انہیں تسلی دیتا رہا کہ میں آ گیا ہوں انہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

اس نے ڈاکٹر کو بلایا اور چند رشتے داروں کو بھی۔

ڈاکٹر انہیں سکون آور دوا کا انجکشن دے کر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد بعض عزیزوں اور پڑوسیوں نے مشورہ دیا کہ پولس کو ڈاکے کی اطلاع دے دی جائے تو ولیم کی ماں نے کہا:

''اس کی ضرورت نہیں۔ بچوں سے اکثر غلطیاں ہو جایا کرتی ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم انہیں معاف کر دیں۔''

کمرے میں موجود تمام رشتے داروں اور پڑوسیوں نے سوچا کہ ولیم کی ماں کو گہرا ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ اس لئے وہ بہکی بہکی باتیں کر رہی ہیں اور یہ بات غلط بھی نہ تھی۔

☆☆☆

حق گوئی :

''حق گوئی سے گریز کرتا ہوں، مجھے سقراط، کرائسٹ، تبریز، منصور اور میرا کا انجام پتہ ہے!''

یک سطری کہانی - ع.ع.خ

اور بادل چھٹ گئے

چاروں طرف اندھیرا تھا۔ میں کون تھا؟ کیا تھا؟ کیوں تھا؟ میرا کیا مصرف تھا؟ مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ خبر اس وقت ہوئی جب میں نے ڈاکٹر سے چھاتی میں جلن کی شکایت کی۔ ڈاکٹر نے مجھے پوری طرح سے چیک کیا اور تشخیص کیا کینسر! مجھے ذرا بھی دکھ نہ ہوا۔ اتنے دکھوں اور غموں سے گزر چکا تھا کہ مجھے لگا زندگی کو ہی کینسر ہو گیا ہے۔ پھیپھڑوں کا کینسر بھلا کیا معنی رکھتا ہے! ڈاکٹر نے کہا کہ کینسر آخری اسٹیج تک پہنچ چکا ہے اور میں کچھ مہینوں کا مہمان ہوں۔ پہلے تو میں بہت تڑپا کہ میں مر کر قفسِ عنصری سے پرواز کر جاؤں گا اور میری کہانیاں! مگر کہانیاں امر رہیں گی اور ان کہانیوں کو امر بنانے کے لئے میں اسپتال میں اُنہیں لکھنے لگا۔

مجھے ایک الگ کمرے میں رکھا گیا تھا اور نئی نئی آئی نرس انوتارہ کو میری دیکھ بھال پر لگایا گیا۔ دو تین دن تو یونہی گزرے۔ وہ آتی، تب میں اٹھ بیٹھ سکتا تھا، نہاتا تھا، سیر کو جاتا تھا۔ مگر پھر جیسے زندگی کی گاڑی پیچھے کی طرف چھوٹتی گئی اور [illegible] موت کے خوفناک غار میں داخل ہو گیا۔ کیا میں ہاتھ پیر ہلا سکوں گا؟ جب تک ہاتھوں میں دم ہے، ساغر و مینا اپنے پاس ہی رکھوں غالب کی طرح! یعنی کہانیاں لکھتا رہوں، صبح سیر کو جاؤں، ورانڈے میں بیٹھے کتے کو پچکاروں، چیتھڑوں میں ملبوس بھکارن کو پیسے دوں۔ کھلے آسمان کو دیکھوں!

پہلے پہلے تو انوتارہ میرا ٹیمپریچر لینے آتی تھی۔ وہ شاید میرا ٹیمپریچر دنیا کے ٹیمپریچر سے ملاتی

تھی۔ مجھے دوا پلاتی تھی۔ مجھ سے اچھی باتیں کرتی تھی۔ کچھ دیر دوست کی طرح قریب بیٹھتی تھی۔ کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ میں کچھ ہی دنوں کا مہمان ہوں!

رات کو جب میرے کمرے کے ارد گرد رات رانی پوری طرح کھل اٹھتی اور اس کی مہک میرے کمرے میں بھر جاتی تو میں کہانی شروع کرتا اور ختم کرتا تو رات بہت بیت چکی ہوتی۔

ایک رات انوتارہ نے مجھ سے پوچھا:

''ابھی تک تم سوئے نہیں؟''

میں نے انوتارہ کی طرف دیکھا۔اس کے ہاتھ میں ناول تھا۔

''کیا کر رہے ہو؟''

''کہانی مکمل کرنا چاہتا ہوں!''

''کل کر لینا اب سو جاؤ۔''

''انو! بہت کم دن بچے ہیں، جتنی زیادہ کہانیاں لکھ پاؤں لکھ لینا چاہتا ہوں، تا کہ یہ کہانی کے روپ میں زندہ رہوں۔''

انوتارہ نے سسکاری بھری۔

''کچھ نہیں، تم سو جاؤ۔''

''انو! بعد میں سونا ہی تو ہے، آج رات جاگنے دو۔''

اور تب انوتارہ میری مسہری کی پائینتی پر بیٹھ گئی اور میری کہانی پڑھنے لگی۔ پھر اس نے میری لکھی ہوئی کہانیاں اپنے ہاتھ میں لے لیں اور کہا:

''میں یہ کہانیاں پڑھوں گی!''

مگر اس دن کا جاگنا مجھے بھاری پڑا۔ دو دن تک میری سانس خوب تیز چلتی رہی اور انوتارہ میری نبض پکڑے رہی جب میری صحت کچھ ٹھیک ہوئی تو اس نے کہا:

جو زندگی بچی ہے اسے خوشی خوشی جیو، تمہاری کہانیاں بہت اچھی ہیں، تم امر ہو جاؤ گے۔''

''انو! سچ کہنا تمہیں میری کہانیاں کیسی لگیں؟''

''تمہاری کہانیاں بہت اچھی ہیں۔ مگر ان کا سبجیکٹ، یاسیت، اداسی، قیدِ حیات و رنج و غم ہے۔ کیا خوشی پر، مسرت پر، پھول کے کھلنے پر، بچے کے مسکرانے پر تم نے کوئی بھی کہانی نہیں لکھی؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''کیوں کہ یہ تمام چیزیں مجھ سے ہمیشہ دور رہیں۔ میرا کوئی نہ تھا۔ نہ ماں کا پیار ملا نہ باپ کی شفقت۔ ہوش سنبھلا تو ممبئی میں ایک ہمدرد کے گھر پرورش پائی جیسے تیسے ایس ایس سی پاس کرنے کے بعد نوکری کے لئے تین مرتبہ Employment Exchange کا فارم بھرا لیکن تینوں مرتبہ میرا فارم غائب کر دیا گیا۔ پتہ نہیں کیوں؟ بہت جدو جہد کی مگر نوکری نہ ملی۔ کتنے میل چلا۔ جانے کتنے دن بھوکا سویا۔ بہت جلد وہ ہمدرد بھی چل بسا۔ بس اس کا کمرہ میرے نام رہ گیا۔ اس گھر کی وجہ سے کچھ آمدنی ہو جاتی، کیوں کہ میں نے ایک پیئنگ گیسٹ رکھ لیا تھا۔ جب سینے میں جلن اور دل میں طوفان پیدا ہوا شہر یار کی طرح تو ڈاکٹر سے ملا۔ ڈاکٹر نے مجھے اس سرکاری اسپتال میں داخل کر دیا۔ میں نے سوچا کینسر ہی تو ہے، چلو قسمت میں یہی سہی۔ اس کے بعد تم مل گئیں۔ تمہارے ساتھ جو مسرت ملی وہ میرے لئے آب حیات ہے۔ ورنہ دنیا سے ملا ہوا زہر اور دھوکا ہی ہے جو میں نے اپنی کہانیوں میں دنیا کو لوٹایا ہے ساحر کی طرح۔''

''ایسا مت کہو۔ تم جوان ہو، خوشی خوشی زندگی جیو۔ اپنی کہانیوں میں دونوں رنگ لاؤ۔ ہنسی بھی، آنسو......''

ڈاکٹر نے چیک کیا اور حیرت سے اس کی دونوں آنکھیں اُبل پڑیں۔

''تعجب ہے تم موت کی طرف نہیں اب زندگی کی طرف بڑھتے جا رہے......''

میں نے اس دن انوتارہ کا ہاتھ چوما۔ انوتارہ نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اس نے کہا:

''میں نے تم سے پیار کیا ہے!''

''مجھ سے پیار کر کے تمہیں کیا ملے گا؟''

''میں نے ایک فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں پیار اور مسرت دوں گی، تمہیں زندگی کی طرف کھینچ لاؤں گی۔ یہ میرا 'موٹو' ہے اور مجھے ففٹی پرسینٹ کامیابی ملی ہے۔ لو یہ مٹھائی کھاؤ اس خوشی میں!''

میں نے مٹھائی کھائی اور میری آنکھوں میں آنسو اُبھر آئے۔ انوتارہ شاید سمجھی ہو کہ خوشی کے آنسو ہیں، لیکن......

میرے کمرے میں انوتارہ نے گل دان اور گملے سجائے۔ مجھے خوب پیار کیا۔ میں نے محسوس

کیا کہ اس کے بنا میرا اب جینا مشکل ہے۔ پھر میں نے جو کہانیاں لکھیں وہ ہر طرح سے مکمل کہانیاں تھیں۔ میں نے ایک ناول بھی لکھنا شروع کیا۔ جس کا نام رکھا '' اور بادل چھٹ گئے۔'' یہ عنوان انوتارہ کو بہت پسند آیا۔ اس نے کہا:

'' بادل چھٹ جائیں، جتنی جلدی اتنا اچھا ہے!''

دوسرے یا تیسرے دن پھر ڈاکٹر نے مبارکباد دی،

" Young man you are progressing very fast. It's a miracle!"

میں نے سوچا، یہ سب انوتارہ کی وجہ سے ہے۔ میں انوتارہ کا مقروض تھا! مجھے ڈسچارج مل گیا۔

میں جیسے صحیح راستہ پا گیا تھا۔ موت کی گھاٹیوں سے چمن میں لوٹ آیا تھا۔ پھر میں اپنے کمرے میں رہنے کے لئے چلا گیا۔ مگر ہر شام میں انوتارہ سے ملے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اب میں خوب جم کر لکھا۔ انوتارہ نے میری کہانیاں بہترین پرچوں اور رسالوں میں بھجوائیں۔ ناول بھی نصف ہو چکا تھا۔ میری کہانیاں ملکی غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہونے لگیں۔ پھر مجھے ایک آفر آیا۔ آفر امریکہ سے آیا تھا۔ وہاں مجھے ایک فیملی میگزین کے اسٹوری سیکشن کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا تھا۔ میں نے انوتارہ سے تذکرہ کیا۔

میرا دل نہیں چاہتا تھا۔ تمام عمر خوشیوں سے محروم شخص کے لئے انوتارہ جیسے مسرتوں کا خزانہ تھی۔ لیکن انوتارا نے کافی اصرار کیا اور میں انکار نہیں کر سکا۔ پھر انوتارہ نے کہا:

'' تم جاؤ اپنا کریئر بناؤ اور مکمل علاج بھی کراؤ، پھر لوٹ کر آؤ گے، تب ہم ....''

'' میں اپنی زندگی کو چھوڑ کر بھلا کہیں جا سکتا ہوں؟''

'' یہی بات اگر میں تم سے کہوں تو؟''

امریکہ پہنچ کر میں مصروف ہو گیا۔ وہاں کی تیز رفتار زندگی اور بھاگ دوڑ میں میں پوری طرح ڈوب گیا۔ پہلے پہلے تو انوتارہ کے خطوط آتے رہے اور میں نے بھی اس کے خطوط کے جواب دیئے۔ شروع شروع میں میں وہاں بے چین رہا جس کا ذکر میں ہر خط میں کرتا تھا۔ اس کی تسلی، پیار اور ہمدردی سے بھرے خط آتے رہے۔ پھر دھیرے دھیرے خطوط کے درمیان فاصلے بڑھتے گئے۔ آہستہ آہستہ میں ایڈجسٹ ہو گیا۔ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ کامیاب ہوتا گیا۔ میگزین خوب چلنے لگا۔ میری تعریفیں ہوتی گئیں۔ اور پھر بہت دنوں تک میں انوتارہ کو خط نہیں لکھ پایا۔ سوچتا کل خط لکھوں گا، مگر ہفتے

گزر جاتے اور مجھے فرصت نہ ملتی۔ اگر خط لکھتا بھی تو انوتارہ کا جواب نہ آتا۔ پھر میں مصروف ہو جاتا۔
پھر پتہ نہیں اچانک کب اور کیسے جینی میری زندگی میں داخل ہو گئی۔ میں اس کے تعلق سے کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ بس وہ میری زندگی میں داخل ہوئی اور مجھے بہا لے گئی۔ میں انوتارہ سے دور ہٹتا گیا۔ قصور تو میرا ہے میں نے جینی کو اپنی زندگی میں کیوں آنے دیا؟ مجھے لگتا ہے میں نے کوئی دروازہ کھلا نہیں رکھا تھا۔ جینی نے نقب لگائی اور میری زندگی میں داخل ہو گئی۔ میں کچھ نہ کر سکا۔ اور پھر ایک دن بچی کے ساتھ جینی میری زندگی سے اچانک چلی گئی۔ مگر یہ سب باتیں میں انوتارہ کو کیسے سمجھا سکوں گا؟

ایک خط جو میں نے سب سے آخر میں انوتارہ کو لکھا تھا، اس کا جواب تک نہیں آیا!
میرا امریکہ کا کانٹریکٹ ختم ہوا تو میں خوشی خوشی وطن لوٹا۔ اب میرا ادھورا ناول ''اور بادل چھٹ گئے'' جلد پورا ہو جائے گا۔
اس روز اتوار تھا اور آسمان گہرے سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں جب اسپتال کے احاطے میں واقع نرسوں کے کوارٹر میں پہنچا اور ایک بوڑھی نرس سے انوتارہ کے بارے میں پوچھا تو وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ کچھ سوچا، پھر چونکی اور مجھے گھور کر دیکھا اور کہا:
''آؤ میرے پیچھے......''
میں اس بوڑھی نرس کے پیچھے کئی بارہ دریوں اور ورانڈوں سے ہوتا ہوا ایک اندھیرے کمرے سے بھی گزرا۔ وہاں ایک اور کمرہ تھا۔ ذرا دیر بعد جب آنکھیں دیکھ سکنے کی حالت میں آئیں تو میں نے دیکھا کہ ایک نحیف اور لاغر جسم کوما میں بستر پر پڑا ہے۔
''اسے پہچانتے ہو؟'' بوڑھی نرس نے کہا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا:
''یہ انوتارہ ہے، لیکن اس کی یہ حالت کب سے ہے؟''
''قریب سال بھر سے!''

☆☆☆

پیار :

''زندگی میں دولت، شہرت، عزت کے علاوہ نفرت، لعنت، حقارت سے بھی نوازا گیا لیکن سکرات میں بھی وہ پیار کے لئے ترستا رہا!''

یک سطری کہانی – ع.ع.خ

سفر

کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بائیکلہ سبزی مارکیٹ میں منہ اندھیرے ہی گاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ سبزی ترکاری سے بھری گاڑیاں دندناتی آتیں، مال اتارتیں اور پھر روانہ ہو جاتیں۔ اس روز بھی لاریوں اور ٹیمپوں سے مال اُتارا جا رہا تھا، بزنس زوروں پر تھا اور بزنس کے ساتھ ساتھ شور وغل بھی۔

ایک چھوکرا آواز لگاتے ہوئے اخبار بیچ رہا تھا۔ شنکر ہاتھ گاڑی والے نے گمچھے سے بدن کا پسینہ پوچھا اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے ہاتھ گاڑی پر بیٹھ گیا۔

''بہت تناتنی ہے۔ کل سمجھو آکرمن ہونے والا ہے۔ ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے، کون جانے کون بچے، کون مرے، سمجھو ہے اس بار اس آگ میں، سارا جگت ہی جل جائے!'' وہ بولا۔

وہاں حمالوں کی بھیڑ تھی۔ چار پانچ حمالوں نے اخبار خرید رکھے تھے اور سرخیاں پڑھ رہے تھے،

''نرنا یک یودھ''

''شترو کو سبق سکھائیں گے۔''

''یار! نرنا یک یودھ کا ارتھ تو سمجھا۔''

''اس کا ارتھ یہ ہے کہ یودھ سے انتم نرنئے ہو جائے گا۔ دونوں کا بہت نقصان ہوگا۔''

جنگ کے بادل کئی دن سے چھائے ہوئے تھے، سرحدوں پر ہزاروں کی تعداد میں فوج جمع ہوگئی تھی، ہر طرف جنگ ہی کا چرچا تھا۔

ایک لاری ڈرائیور نے انگوچھے سے منہ پوچھتے ہوئے کہا:

''ارے! کچھ نہیں ہوگا۔ یہ سالے چلاتے رہتے ہیں اور رہے اخبار والے تو وہ تو ایسی ہی خبروں کو ہوا دیتے ہیں۔ دونوں کے پاس ایٹم بم ہے، وہ کیسے جنگ کریں گے، دونوں ہی تباہ ہو جائیں گے اور دوسرے بڑے ملک کبھی نہیں چاہیں گے کہ جنگ ہو، کیوں کہ انہیں ہتھیار بیچنے ہیں اور اِن سے جی حضوری کرانی ہے۔''

سب حمال سر ہلا کر ہنسنے لگے۔ ڈرائیور نے بیٹھے ہوئے حمالوں سے کام کرنے کے لئے کہا۔ حمال لاری پر چڑھ گئے اور رسّیاں کھولنے لگے تاکہ آلو پیاز کی بوریاں نیچے اتاری جاسکیں۔ شنکر کی ہاتھ گاڑی پر کچے کیلے لدے ہوئے تھے۔ شنکر اپنی ہاتھ گاڑی ہٹانے لگا کیوں کہ ایک ٹیمپو ہارن دے رہا تھا۔ شنکر نے گٹکا منہ میں ڈالا، اخبار ہاتھ گاڑی کے پہیے کے پاس رسی میں اُڑس دیا اور گاڑی کھینچتا ہوا جے جے اسپتال کی طرف چلا جہاں کیلے کی بکھار میں اسے ڈیلیوری دینی تھی۔ اس کے بدن سے پسینہ رس رہا تھا اور گلے کی نسیں گاڑی کھینچتے ہوئے ابھر ابھر آتی تھیں۔ وہ کندھے پر گمچھا رکھے، نیکر اور بنیان پہنے ہاتھ گاڑی کھینچتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک اسے اپنی پیٹھ میں درد محسوس ہوا۔ اس علاقے میں دور دور تک دیسی شراب کا اڈہ نہیں تھا۔ اگر شراب پی لیتا تو اس کے بدن کا درد مٹ جاتا!

کیلے کی بکھار میں ڈیلیوری دے کر شنکر نے مزدوری لی اور اپنی کھولی پر جا پہنچا۔ کھولی میں لکشمی، گنپت کو نہلا رہی تھی۔ چھوٹی بچی شیونتی کی ناک بہہ رہی تھی اور گلے سے ریں ریں کی آواز نکل رہی تھی۔ شنکر نے پسینہ پونچھا اور شیونتی کی ناک پونچھ کر اسے گود میں اٹھا لیا مگر شیونتی تھی کہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ وہ کونے میں چٹائی پر بچی کو لے کر بیٹھ گیا اور اسے بہلانے لگا کہ وہ چپ ہو جائے۔ لکشمی نے گنپت کو نہلا کر اس کا بدن پونچھا اور ایک بدرنگ چڈی اس کی کمر میں اٹکا دی۔ پھر پانی کا گلاس، چائے کا کپ اور بٹاٹا پوہے کی سا سر شنکر کے سامنے لا کر رکھ دی اور شیونتی کو گود میں اٹھا لیا۔

لکشمی نے پوچھا:

''آرام کرو گے یا پھر کام پر جاؤ گے۔''

''جاؤں گا۔''

بٹاٹا پوہے کھانے کے بعد شنکر نے پانی پیا اور چائے پی کر چلا گیا۔ لکشمی نے شیونتی کو دودھ پلا کر سلا دیا۔ گنپت باہر کھیلنے چلا گیا۔ لکشمی اخبار پڑھنے لگی لیکن خبریں اسے متوجہ نہیں کر سکیں اس لئے وہ معمہ حل کرنے بیٹھ گئی۔

لیکن لکشمی کی زندگی تو خود ایک معمہ تھی، اسے کون حل کرے گا؟

وہ ابھی چھوٹی ہی تھی مگر اسے اچھی طرح پنڈھر پور کے وٹھوبا کا وہ عالیشان مندر یاد ہے جہاں ہندوستان بھر سے لوگ کھڑا وٹھوبا کی مورت دیکھنے آتے تھے، اس کا باپ وشنو مندر میں چڑھاوے کی چیزیں بیچتا تھا۔ کسی نے لالچ دی کہ ممبئی میں وہ اس کی لڑکیوں کو نوکری سے لگا دے گا۔ وشنو کی مالی حالت خراب تھی۔ چار کنواری لڑکیوں کا بوجھ سر پر تھا اور پانچویں لڑکی لکشمی بارہواں سال پورا کر چکی تھی۔ پہلے تو اس نے لکشمی کو ممبئی بھیجنے کے لئے حامی نہیں بھری، لیکن معاوضہ بڑھا دینے پر وشنو نے لکشمی کو اس آدمی کے حوالے کر دیا۔ ممبئی لا کر اس شخص نے لکشمی کو ریڈ لائٹ ایریا کی کسی نائیکہ کو بیچنے کی کوشش کی مگر لکشمی کو وقت پر سودے کی سُن گُن ہوگئی اور وہ وہاں سے نکل بھاگی۔ ادھر اُدھر چھپتے چھپاتے وہ بائیکلہ مارکیٹ پہنچ گئی اور وہاں عورتوں بچوں کو راستے پر ہرا مصالہ، سبزی ترکاری وغیرہ بیچتے ہوئے دیکھا تو خود بھی اُن میں شامل ہوگئی۔

رات میں لاریوں سے جب مال اتارا جاتا تھا تو بہت سا مال نیچے گر جاتا تھا، عورتیں اور بچے وہی مال جمع کرتے اور صبح اس مال کے 'واٹے' لگا کر بیچ دیتے۔ کچھ لوگ تو بوریوں پر بلیڈ چلا کر مال چوری بھی کرتے تھے۔ لکشمی نے یہ سب دیکھا اور خود بھی ٹرکوں سے گری ہوئی سبزیاں ترکاریاں جمع کر کے بیچنے لگی۔ کچھ دن تو سب ٹھیک چلا لیکن پھر پولس والے پریشان کرنے لگے۔ وہ سبزی ترکاری بیچنے کی جگہ بدلتی رہی۔ مارکیٹ میں ہی شنکر سے اس کی ملاقات ہوگئی جو شروع سے ہی اس کی مدد کرنے پر آمادہ تھا۔ چنانچہ شنکر نے اسے اپنی کھولی میں رہنے کی جگہ دے دی۔

لکشمی کو شنکر کے ساتھ رہتے رہتے چھ برس گزر چکے تھے۔

اب وہ دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔

ابتدا میں تو شنکر اس کے ساتھ پیار محبت سے پیش آتا رہا لیکن لکشمی یہ محسوس کئے بنا نہ رہ سکی کہ

شنکر کے برتاؤ میں ان دنوں تبدیلی آ گئی ہے۔ پھر وہ دن بھی آیا جب کچھ بتائے بغیر وہ غائب ہو گیا۔ پوچھ تاچھ کرنے پر لکشمی کو پتہ چلا کہ شنکر کی ہاتھ گاڑی کا لائسنس نہیں تھا، اس لئے میونسپلٹی والوں نے ہاتھ گاڑی ضبط کر لی تھی اور شنکر کے پاس ہاتھ گاڑی چھڑانے کے لئے روپئے نہیں تھے۔ روزگار کا ذریعہ ہاتھ سے نکل جانے کی ندامت شنکر نہ سہہ سکا۔

شنکر کہاں تھا، کسی کو پتہ نہیں تھا۔

مگر ایک ہی ہفتے بعد لکشمی کی زندگی زلزلے سے لرز گئی۔

شنکر اپنی بیوی اور بچوں کو گاؤں سے لے آیا۔ ان سب نے مل کر لکشمی اور اس کے دونوں بچوں کو کھولی سے باہر نکال دیا۔ اس کے حاملہ ہونے کا بھی ان پر کوئی اثر نہ پڑا۔ لکشمی کافی لڑی جھگڑی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ لکشمی نے دھمکی بھی دی کہ وہ پولس میں شکایت کرے گی مگر شنکر نے اسے دھمکایا کہ اگر وہ تھانے گئی تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔

اب لکشمی اپنے بچوں کے ساتھ پھر اکیلی تھی۔ دن کا چین اور رات کی نیند غائب تھی۔ شنکر کے رہتے ہوئے جو نگاہیں اس کی طرف نہ اٹھتی تھیں وہی اب اسے رغبت اور چاہت سے دیکھنے لگی تھیں۔ آسمان میں بادلوں کے بیچ کہیں کہیں دھندلے تارے چمک رہے تھے جیسے ریشمی اندھیرے پر کورے کے پیوند لگے ہوں، ہوا بند تھی اور فضا پر اسرار!

بچے بھوکے تھے، اس کی ہمت نہ تھی کہ کسی سے کچھ مانگے۔ 'ٹن' کی آواز آئی اور وہ چونک پڑی، گنپت کے ہاتھ میں تھمے ایلومینیم کے کٹورے میں کسی راہ گیر نے ایک روپئے کا سکہ ڈال دیا تھا۔ لکشمی کا حوصلہ بڑھا۔ اب ہر آنے جانے والے سے اس کا سوال تھا:

''بچے بھوکے ہیں بابو صاحب۔ روپیہ دو روپیہ دے دو۔''

وہ بڑھی جا رہی تھی کہ ایک کار زناٹے کے ساتھ گزر گئی۔ ہوا کی تیزی سے گنپت کا کٹورا زمین پر گر پڑا۔ لکشمی کٹورا اٹھا کر جب پلٹی تو دیکھا کہ شیونتی غائب ہے۔ ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں، وہ اسے سڑک پار والی دکان کے قریب کھڑی نظر آئی۔ دکان پر ایک بچہ بیٹھا امرود کھا رہا تھا اور شیونتی اس لڑکے کو بھوکی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اتفاق سے اس وقت کمیونسٹ پارٹی کا ایک جلوس مہنگائی بھتہ کے خلاف نعرے لگاتا گزر رہا تھا۔ جب وہ گزر گیا تو شیونتی دکان کے سامنے سے غائب تھی! وہ دیوانہ وار چیخ چیخ کر شیونتی کو آواز دینے لگی اور جب بہت ڈھونڈنے پر بھی وہ نہ ملی تو گنپت کے ساتھ سڑک

کے کنارے بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔ راہ گیروں نے ترس کھا کر کٹورے میں اور بھی سکّے ڈالے!

اور اچانک سدھا کر وہاں آ گیا۔ سدھا کر اسے بہت دنوں سے جانتا تھا۔

’’ارے لکشمی وہینی! کائے زالا، کشالا رڑتمیں؟‘‘ (ارے لکشمی بھابھی! کیا ہوا، کیوں رو رہی ہو؟‘‘

لکشمی نے اسے سارا واقعہ سنایا۔ سدھا کر نے اسے دلاسہ دیا، ماں بیٹے کو کھانا کھلایا۔ جب چہرے پر تازگی آئی تو سدھا کر نے کہا:

’’اب چل میرے کمرے میں آرام کر، اپن شام کو پولس تھانے میں شیونتی کے گم ہونے کی کمپلین کریں گے، تو چنتا مت کر۔ تیرے پاس اس کی کوئی فوٹو ہے؟‘‘

’’کائی کی فوٹو، میرے کو معلوم تھا کہ وہ گم ہو جائے گی؟‘‘

’’کوئی بات نہیں، پولس تھانے میں میری پہچان کا حولدار ہے جو ہر ہفتے ہفتہ لینے میرے پاس آتا ہے، وہ اپنی مدد کرے گا۔‘‘

کمرے میں جب لکشمی آئی تو سدھا کر نے کہا:

’’کیا سوچ رہی ہے، اپنی جوانی کا خیال کر، بچے کا سوچ۔‘‘

’’اگر تو نے بھی بے درد بن کر مجھے چھوڑ دیا تو؟‘‘

’’آئی شپت (ماں کی قسم) میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔‘‘

سدھا کر خراٹے بھر رہا تھا۔ صبح صبح لکشمی جاگ گئی تو اس نے دیکھا گنپت اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ لکشمی نے جھپٹ کر اپنے سینے سے لگایا مگر گنپت نے منہ موڑ لیا۔

لکشمی نے سوچا۔ کیا ننھی سی جان بھی سب کچھ سمجھنے لگی ہے؟

’’گنپت میں نے جو کیا، سودا ہی سہی، تیری خاطر اور عورت ذات بے سہارا جئے تو کیسے جئے!

تبھی اتفاق سے سدھا کر کی آنکھ کھل گئی۔

’’لگا لے کلیجے سے، بن گئی سچی ماں۔‘‘

لکشمی کو لگا کہ سدھا کر نے اس کے منہ پر چانٹا سا مارا ہے۔

''اور تو؟'' اس نے چیخ کر پوچھا۔

''میں بھی تیرے ساتھ راتوں رات باپ بن گیا......''

سدھاکر ہنسنے لگا تو لکشمی بھی مسکرادی۔

ایک صبح۔

لکشمی سرکاری زچہ خانہ سے باہر نکلی تو جسم ہلکا مگر دل بھاری تھا، اس کے پاس شنکر کے پھر دو لڑکے تھے۔

سدھاکر اب زیادہ وقت کمرے ہی میں پڑا رہتا تھا۔ اس سے اب 'بوجھ' نہیں اٹھایا جاتا تھا۔ شراب زیادہ پینے سے اسے لیور کا درد رہنے لگا تھا۔

آج بھی سدھاکر صبح سے گھر بیٹھا تھا، لکشمی اور بچے بھوکے تھے۔

اس نے سدھاکر سے پوچھا:

''ایسا کب تک چلے گا۔''

سدھاکر نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور بولا:

''تو چاہے تو ساری مشکلیں دور ہوسکتی ہیں۔''

''کس طرح؟''

''تو ایسا کر سکھ دیو ڈرائیور کے گھر جا کر روز جھاڑو پونچھا کر۔ میں تو اب کام نہیں کر سکتا۔''

''وہ تو اکیلا رہتا ہے۔''

''تو کیا ہوا؟''

''تو کیا میرے کو ویشیا بنانا چاہتا ہے۔ دیکھ سدھاکر میں شنکر اور تیرے ساتھ مجبوری میں رہی، لیکن میں نے اپنی آبرو کا سودا نہیں کیا۔''

''سالی! میرے کو اُپدیش دے رہی ہے۔ پتی ورتا کا ڈھونگ مت رچا، تیرے میں اور ایک ویشیا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور جو میں کہتا ہوں وہ کر۔''

''میں بھیک مانگ لوں گی مگر ویشیا نہیں بنوں گی۔''

سدھا کرنے اٹھ کر لکشمی کے منہ پر زناٹے دار طمانچہ رسید کر دیا اور گرجتے ہوئے بولا:
"نکل جا میرے کمرے سے دوبارہ مجھے منہ نہیں دکھانا سالی نکل....."
لکشمی نے غصے سے اس کے منہ پر تھوک دیا اور بچوں کو لے کر جھٹکے سے باہر نکل گئی۔"

☆☆☆

بانسری :

"روم جل رہا تھا اور نیرو بانسری بجا رہا تھا، آج بھی تو وہی ہو رہا ہے!"

یک سطری کہانی - ع.ع.خ

بلینکیٹ

* افسانہ ''بلینکیٹ'' روشنائی/افسانہ صدی نمبر حصہ سوم، شمارہ ۳۱، ص ۳۵۳ پر شامل ہے۔

فرانسس نے دو ٹکڑوں میں تقسیم فلمی پوسٹر پر لئی لگائی جس کے پہلے ٹکڑے میں ہیروئن کی آنکھیں تھیں اور دوسرے میں ہونٹ تھے، دونوں کو ملا کر دیوار پر پرانے پوسٹر پر یہ نیا پوسٹر چپکا دیا گیا۔ دیوار خوبصورت ہوگئی۔ کچھ پوسٹر اس نے ایسی دیوار پر بھی چپکائے جن کا پلاسٹر اُدھڑ چکا تھا۔ ایک جگہ لکھا تھا: Stick no bills (یہاں پوسٹر نہ لگائیں) لیکن فرانسس نے ہمیشہ کی طرح بلا تکلف اس لکھی ہوئی ہدایت پر بھی پوسٹر چپکا دیا اور جانے کسے گالی دی، اس کے ساتھی شنکر نے پوچھا:

''کیا بات ہے یار؟''

فرانسس نے کہا:

''سالا ادھر لکھے لا ہے پوسٹر مت لگاؤ، تو پھر سالا کدھر لگانے کا؟''

''ٹھیک ہے۔'' شنکر بولا، ''جہاں لکھا ہوتا ہے پیشاب نہ کرو وہاں لوگ پیشاب کرتے ہیں۔ میں نے ایک حوالدار کو بھی وہیں پیشاب کرتے دیکھا تھا جہاں انگریجی میں لکھا تھا Don't piss، اور سالے کتوں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ بس ایک ٹانگ اٹھائی نہ جگہ دیکھی نہ ٹھکانہ، انہیں سالا کون روکتا ہے۔''

''ہی ہی ہی'' وہ ہنسنے لگے۔

وہ اپنا کام رات بارہ بجے کے بعد شروع کرتے اور تین چار گھنٹوں میں سارے علاقے میں پوسٹر چپکا دیتے۔ان کے پاس سائیکلیں ہوتیں اور سائیکل کے ہینڈل سے لئی کا ڈبہ ٹنگا ہوتا۔سائیکل کے کیریئر پر اشتہاروں کا بنڈل رکھا ہوتا۔وہ لوگ بڑی پھرتی کے ساتھ سڑک پر پوسٹر رکھتے ،لئی لگاتے اور جگہ جگہ دیواروں، کھمبوں اور پرانے پوسٹر پر وہ نئے پوسٹر چپکا دیتے۔اگر اونچائی پر پوسٹر چپکانا یا بینر لگانا ہوتا تو وہ سائیکل یا ٹیکسی کے ذریعے سیڑھی بھی لے جاتے،ٹولی کے تقریباً تمام افراد کے ہونٹوں تلے تمباکو دبا ہوتا جو چونے میں دیر تک ہتھیلی پر مسلا جاتا ،پھر تمباکو چٹکی میں لے کر وہ ہونٹ کے اندر رکھتے اور اپنا کام شروع کر دیتے۔تھوڑی تھوڑی دیر میں تھوکتے بھی جاتے۔جب وہ فلم کے پوسٹر لگاتے اس وقت وہ برسٹل سگریٹ کا کش لگانا نہ بھولتے کیوں کہ پوسٹر کو دیکھ کر وہ خوابوں میں کھو جاتے تھے۔

فرانس پوسٹر لگانے والی ٹولی کا ایک فرد تھا،اس ٹولی میں ہندو مسلم اور کرسچن سبھی مذہب کے افراد تھے، زیادہ تر ان پڑھ تھے،فرانس تین جماعت تک پڑھا تھا۔اسے پتہ نہیں وہ کب اس ٹولی میں شامل ہو گیا تھا، ہو سکتا ہے وہ پہلے بھیک مانگتا رہا، اسے تو صرف اتنا یاد ہے کہ وہ بائیکلہ کا ایک پادری تھا جس نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔اسے اپنے ماں باپ کے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا۔

فلائی اوور کے نیچے جس چبوترے پر فرانس سوتا تھا وہاں آس پاس کار، اسکوٹر اور موٹر سائیکل والوں کی پارکنگ تھی۔فرانس سلبھ شوچالئے میں نہاتا اور قریب ہی کی ریسٹورنٹ میں چائے پاؤ کھاتا تھا۔وہ رات میں پوسٹر چپکاتا اور دن بھر سوتا۔آس پاس گرد پینے والے زور زور سے باتیں کرتے کرتے کبھی کبھی گالی گلوچ اور ہاتھا پائی پر اتر آتے، ٹرافک کا شور الگ ہوتا مگر فرانس کی نیند میں خلل نہ پڑتا تھا کیونکہ وہ ان تمام باتوں کا عادی ہو گیا تھا۔جب وہ سونے کے لئے اپنی مخصوص جگہ پر آتا تو اس کا پیارا کتا جمی اس کا انتظار کر رہا ہوتا۔جمی کو بھی پاؤ بسکٹ کھلا کر اور پیار کر کے وہ چین سے نیند کی وادیوں میں چلا جاتا۔جمی اس کی رکھوالی کرنے لگتا۔

فرانس کے پاس ایک بیگ تھا جس میں ایک جوڑی کپڑا، تاویل،شیونگ ریزر اور صابن

وغیرہ تھے۔ فرانس منکا کھیلتا، ٹھرّا پیتا اور کبھی کبھی شام میں بھٹیار خانے کے سامنے فقیروں کے بیچ بیٹھتا تو کوئی صاحبِ دل کھانا کھلا دیتا۔ وہ ہر اتوار بائیکلہ چرچ میں ماس اٹینڈ کرتا تھا۔ ایک بار پادری نے اس سے پوچھا تھا:

''فرانس کیا تم نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا؟ کیوں کہ میں نے تمہیں کنفیشن باکس میں کبھی نہیں دیکھا۔''

فرانس حیرت سے بولا تھا:

''فادر! گناہ کیا ہوتا ہے اپن کو نہیں معلوم، نہیں تو ماں قسم اپُن جرور کیا ہوتا۔''

اس کی بات پر پادری دیر تک ہنستا رہا تھا۔ فرانس بھولا بھالا تھا، پادری سوچتا، کاش! دنیا کے لوگ اسی طرح بھولے ہو جائیں تو دنیا میں پاپ ہی نہ ہوں۔

فادر کی بات کا ذکر جب فرانس نے شنکر سے کیا تو شنکر نے کہا:

''اپنے کیے پر پچھتانا پاپ ہے اور کیے کو بھول جانا پُن ہے۔''

یہ بات فرانس کی سمجھ میں نہ آئی تھی اس نے سوچا کبھی فرصت میں پادری سے اس بارے میں ضرور پوچھے گا۔

وہ لوگ کھیت واڑی کے علاقے میں پوسٹر چپکانے لگے تو پولس کی گاڑی وہاں آ کر رکی۔ ایک حوالدار نے کہا:

''تم لوگ جلدی سے کام کر کے بھاگو۔'' اتنا کہہ کر پولس گاڑی چلی گئی۔ وہ لوگ جلدی جلدی پوسٹر چپکا کر دوسرے علاقے میں چلے گئے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ ایک جوان لڑکی رات دو بجے سڑک سے گزر رہی تھی۔ ٹولی کے افراد نے دیکھا کہ کچھ غنڈے اس کے پیچھے لگے ہیں اور لڑکی ''بچاؤ بچاؤ'' چیخ رہی ہے۔ تب فرانس اور اس کے ساتھیوں نے لڑکی کو غنڈوں سے بچایا تھا جس میں مار پیٹ ہوئی تھی اور غنڈے دھمکی دے کر بھاگ نکلے تھے۔ بعد میں پولس والے آئے اور لڑکی کو وین میں بٹھا کر لے گئے۔ تب شنکر نے کہا تھا:

''اب دیکھنا پولس والے اس لڑکی کا کیا حال کرتے ہیں۔''

فرانس نے کہا:

''جانے دے، اپن نے اسے غنڈوں سے بچایا، گاڈ! اسے پولس والوں سے بچائے گا۔''

''کھی کھی کھی کھی'' سب ہنسنے لگے۔

سوٹیبل بوائے، گاڈ آف اسمال تھنگز، لاسٹ لافٹر، پرویز اور وشنوز ڈیتھ کتابیں کہانی کار نے بڑی بے اطمینانی سے شیلف میں لگادیں اور کافی کا ایک گھونٹ لیا تو اسے گرمی سی محسوس ہوئی۔ وہ اپنے فلیٹ سے گیلری میں آیا اور فلائی اوور کے نیچے دیکھنے لگا۔ فلائی اوور سے کاریں، موٹر سائیکلیں اور اسکوٹرس تیز رفتاری سے گزر رہی تھیں اور نیچے پارکنگ کے بیچوں بیچ چبوترے پر وہ شخص لیٹا تھا۔ کہانی کار نے محسوس کیا کہ آج شاید اسے کوئی کام نہیں ہے اس لئے یہاں لیٹا ہے، حسب معمول کتا اس کی رکھوالی کر رہا تھا۔

ایک بار شنکر نے فرانسس سے کہا تھا کہ اس کی جھونپڑپٹی میں ایک پادری اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ آیا اور اس سے کہنے لگا کہ وہ ان کا دھرم اپنا لے۔ اس کے بدلے اسے اچھی نوکری ملے گی۔ شنکر نے پوچھا:

''فرانسس کیا دھرم کے ساتھ نام بھی بدلنا پڑے گا؟''

فرانسس نے کہا:

''میرے کو مالوم نہیں، تو وہچ پادری سے پوچھنا۔ کرچین ہوتے ہوئے بھی کیا میرے کو اچھی نوکری ملی ہے؟ سب دھرم اچھے ہیں۔ دیکھ بھوک سب کو لگتی ہے، اس لئے میرے حساب سے بھوک سب سے بڑا دھرم ہے، ہے کہ نہیں؟''

فرانسس نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا:

''اپُن کی ٹولی میں پہلے ایک چاچا تھا۔ وہ شایر بھی تھا۔ سیڑھی پر چڑھ کر پوسٹر لگا رے لا تھا۔ اس کا پاؤں پھسلا اور وہ نیچے گر گیا۔ بس دیتھ کو بہانا مل گیا۔ ہوسپٹل لے کے جانے سے پہلے ہیچ اس کی دیتھ ہوگئی۔ گاڈ بلیس ہم۔ ایک بار وہ میرے کو بولا تھا کہ اپُن کو بھوک لگتی ہے، اپُن کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ اس واسطے اپُن کوئی گناہ نہیں کرتے۔ جس کا پیٹ بھرے لا ہوتا ہے وہچ گناہ کا سوچتا ہے۔ پھر اس نے ایک مجے دار بات بولا ہوتا، 'بیٹا جندگی کیا ہے؟ پیڑ میں گٹھلی اور گٹھلی میں پیڑ'۔''

''کیا مطلب؟'' شنکر نے پوچھا۔

فرانسس نے سمجھاتے ہوئے کہا:

''دیکھ اپن گٹھلی جمین میں ڈالیں گے تو پیڑ نکلتا ہے اور اس پیڑ میں جو پھل نکلتا ہے اس میں گٹھلی ہوتی ہے۔ دنیا ایسے چ چلتی ہے چلتی چ رہے گی۔ سب سے بڑا ان داتا سورج ہے۔ اس کے بغیر کچھ نہیں۔''

''برابر دوست۔'' شنکر نے ہامی بھری۔

اس سال خوب برسات ہوئی تھی اس لئے سردی بھی زوروں پر تھی۔ فرانسس نے ٹھرّا پی کر کھانا کھالیا اور چبوترے پر پلاسٹک بچھا کر سو گیا تھا۔ آج رات بھی اسے کوئی کام نہ ملا تھا۔ ٹھرّے کی گرمی سے آنکھ تو لگ گئی مگر رات قریب دو بجے جب سردی کا زور بڑھا تو اس کے ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے اور وہ کپکپانے لگا۔

گیلری سے کہانی کار دیکھ رہا تھا کہ وہ شخص کانپ رہا ہے۔ اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے ایک بلینکیٹ اٹھایا، چوتھے منزلہ سے نیچے آیا۔ سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے اس شخص کے گلے میں ایلومینیم کا کراس پینڈنٹ کالے ڈورے میں پڑا تھا۔ کہانی کار نے اس شخص کے جسم پر بلینکیٹ ڈال دیا۔ نیند میں فرانسس نے محسوس کیا کہ کوئی پری آئی اور اس نے اسے اپنے پروں میں چھپالیا۔

کہانی کار اپنے فلیٹ میں پہنچا۔ اوپر سے پھر نیچے کا نظارہ کیا، وہ شخص آرام سے سویا تھا۔ اس کی کپکپاہٹ تھم گئی تھی۔ کہانی کار مطمئن ہو کر سونے چلا گیا۔ لیکن وہ دیر تک سو نہ پایا۔ اسے اپنے بچپن میں پڑھی ایک کہانی بار بار یاد آتی رہی۔ جس میں ایک غریب بچہ دن بھر بھیک مانگتا ہے اور کوئی اسے بھیک نہیں دیتا تو وہ بھوکے پیٹ سو جاتا ہے۔ سردی کے دن ہیں۔ رات میں برف باری ہوتی ہے اور قدرت ایک برف کی چادر سے سوئے ہوئے بچے کو ڈھک دیتی ہے۔ کہانی کار سوچنے لگا کیا اس شخص کا بھی یہی حال ہوگا؟

صبح جب کہانی کار جاگا اور گیلری میں آیا تو چونک گیا۔

عجیب منظر تھا۔ نیچے چبوترے کے پاس دو پولس والے اور ایک سب انسپکٹر کھڑے ہوئے پنچ نامہ کر رہے تھے۔ ایک ٹرالی بھی تھی اور ٹرالی کے ساتھ منہ پر کپڑا باندھے دو آدمی کھڑے تھے۔ سب انسپکٹر کے اشارے پر ان آدمیوں نے لاش میں تبدیل اس شخص کو ٹرالی پر لٹا کر اس پر پلاسٹک شیٹ ڈال کر بلینکیٹ وہیں چھوڑ دیا۔ اور ٹرالی لے کر چلے گئے۔ غم زدہ کتا بھی ان کے پیچھے پیچھے

چلا گیا۔

تبھی ایک لاغر سا شخص نمودار ہوا اور اس نے چھوڑا ہوا وہ بلینکیٹ اٹھا لیا، پھر اسے لے کر اس تیزی سے بھاگا جیسے کوئی اس سے بلینکیٹ چھین لے گا۔

☆☆☆

سویٹر :

''اُس نے ٹھٹھرتے ہوئے صندوق کھولی، سویٹر پر دیمک لگ چکی تھی!''

یک سطری کہانی - ع.ع.خ

نئی بہو

چندن جی کے گھر بہو آئی، وہ کانونٹ کی پڑھی لکھی انگریزی بول چال میں ماہر تو تھی ہی، فیشن ایبل بھی تھی اور چندن جی کی برادری میں سب سے زیادہ جہیز ساتھ لائی تھی۔ زیورات، فرنیچر اور کپڑوں کی تو بات ہی چھوڑیئے، برتن بھی معمولی چیز ہیں، رنگین ٹی وی، فریج، موبائیل، ڈیجیٹل کیمرہ، مووی کیمرہ، مائیکرو ویواوون، ایئر کنڈیشنر، "Loreal" میک اپ کِٹ اور واشنگ مشین بھی لائی تھی اور ہر چیز میں کچھ نہ کچھ نیا فنکشن تھا جو دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کر دیتا تھا، جیسے واشنگ مشین میں کپڑے دھونے کے علاوہ سکھانے کا بھی انتظام تھا۔ ٹی وی کا اسکرین چھوٹا بڑا کیا جاسکتا تھا، جدید ترین ماڈل کا موبائیل تھا جس سے کیمرہ جڑا ہوا تھا۔ یہ تمام اشیاء، بہن کی شادی میں بڑے بھائی نے افریقہ سے بھجوائی تھیں جہاں وہ ایک گجراتی کے ساتھ پیٹرول پمپ کے کاروبار میں حصہ دار تھا۔ یوں بھی بہو کا خاندان متموّل تھا، چندن جی کی بھی سانتا کروز میں مٹھائی اور بھیل پوری کی بہت بڑی دکان تھی جو رات دن خوب چلتی تھی۔

نئی بہو کوشلیا، واشنگ مشین کے ساتھ ایسے ایسے واشنگ پاؤڈر لائی تھی جن سے کپڑوں پر لگا ہر طرح کا گہرا ہلکا داغ دُھل جاتا تھا۔ پر اتنا جہیز لانے پر بھی چندن جی کی بیوی پاربتی کو کوشلیا ایک آنکھ نہ بھائی نہ انہیں اس کالایا ہوا جہیز پسند آیا۔ پاربتی پرانے خیالات کی عورت تھی۔ ان کا خاندان

گنگا کنارے داہ سنسکار کرتا تھا۔ اسی لئے تو آج تک ممبئی شہر میں ہوتے ہوئے بھی وہ مٹی کے چولہے ہی پر اور مٹی کی ہانڈی میں ہی کھانا پکاتی تھی اور اپنے کمرے میں جھاڑو پونچھا بھی خود ہی کرتی تھی۔ ادھر چندن جی اٹھتے بیٹھتے بہو کے گھرانے کی اور خود بہو کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے تھے۔ اس کے لائے ہوئے جہیز کا ذکر کرتے اور کہتے کہ برادری میں ان کی ناک اونچی ہوئی ہے۔ یہ شادی چندن جی اور ان کے بیٹے منوج کی پسند سے ہوئی تھی۔

دھوبی ننکو چندن جی کے گھر پہنچا تو پاربتی نے ننکو کو حسبِ معمول اندر بلایا، شکایت کی کہ وہ ان کے لڑکے منوج کی شادی میں کیوں نہیں آیا؟ ننکو نے کہا:

''سیٹھانی جی! شادی مُلک میں ہوئی، مُلک جانے کے لئے ٹائم تھا اور نہ پیسہ ہی تھا۔ یہاں تو برے حال ہیں، روٹی کے لالے پڑے ہیں کیا کیا جائے؟''

''کیوں تیرا لڑکا تو کسی سنار کی دکان پر تھا نا؟''

''اس نے کام چھوڑ دیا ہے۔''

''کیوں؟''

''بس! سیٹھ نے ایک بار ڈانٹا تو کام چھوڑ دیا، آجکل کے لڑکوں کا کوئی بھروسہ ہے، پتہ نہیں ان کا آگے کیا ہوگا!''

''اب کیا کرتا ہے؟'' پاربتی نے پوچھا۔

''کیا کرے گا، نوکری کی تلاش کا بہانہ کر کے گھومتا رہتا ہے اور پھر آپ کو تو پتہ ہی ہے اس علاقے میں ہمارا دھندا بھی کم ہوتا جا رہا ہے، لوگ گھروں میں کپڑے دھو رہے ہیں، گھریلو عورتوں نے واشنگ مشینیں خرید لی ہیں، واشنگ مشین ہماری سوت بن کر آئی ہے۔ بس! دو چار ہوٹل ہی ہیں جن کے کپڑے دھو کر گزر بسر کرتے ہیں۔''

''کیا کرے بھائی۔'' پاربتی نے کہا، ''کیا زمانہ آ گیا ہے، ورنہ کچھ برسوں پہلے اتنا کام تھا بمبئی میں کہ آدمی نہیں ملتے تھے۔ خیر آؤ۔ بہو سے ملاتی ہوں۔''

پاربتی نے بہو کو آواز دی:

''کوشلیا!......''

کوشلیا ٹی وی سیریل دیکھ رہی تھی۔ وہ سفید ٹاپ اور بلیو رنگ کی جینز میں چلی آئی اور ننکو کو

نمسکار کیا۔ ننکو نے دعائیں دیں۔

ننکو کو کوشلیا نے ایک طشتری میں لڈو اور پانی لا کر دیا۔ ننکو لڈو کھانے لگا تو پاربتی نے بہو سے کہا:

''بہو! میں نے میلے کپڑے کونے کی دراز میں رکھ دیئے تھے، ذرا لا کر دے تو دے۔''

کوشلیا بولی:

''وہ تو ماں جی میں نے دھونے کے لئے واشنگ مشین میں ڈال دیئے، بس آدھے گھنٹے میں دُھل کر سوکھے سکھائے نکل آئیں گے۔''

ننکو کے حلق میں جیسے لڈو پھنس گیا۔ اسے ٹھسکا لگا تو گلاس بھر پانی اس نے غٹا غٹ پی لیا۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد ساس نے بہو سے کہا:

''سن بہو، کل ان کے جھبّے پر چائے گر گئی تھی، اس کا داغ ننکو کے علاوہ بھلا کون نکال سکتا ہے، وہ دے دے۔''

بہو جھٹ سے بولی:

''ماں جی! وہ داغ بھی میں نے فارین کے واشنگ پاؤڈر سے نکال دیا ہے، دیکھئے کتنا چکا چک سفید ہو گیا ہے۔'' اور اس نے چندن جی کا جھبّا لا کر سامنے پھیلا دیا۔ ننکو کے لئے اب وہاں ایک لمحہ بھی ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اسے جلدی سے یہاں سے بھاگ جانا چاہئے! پاربتی کو نمسکار کرتے ہوئے وہ گھر سے نکل آیا۔

کوشلیا صرف واشنگ مشین سے کپڑے دھو کر گھریلو کاموں میں ہاتھ بٹاتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ دوسرا کوئی واشنگ مشین کو ہاتھ لگائے، خراب ہونے کا جو ڈر تھا! ساتھ ہی ساتھ وہ واشنگ مشین کے ذریعے گھر والوں پر اپنا Impression قائم رکھنا چاہتی تھی۔

سانتا کروز سے دو بسیں بدل کر ورلی ہوتا ہوا، دو ایک ہوٹل سے کپڑے جمع کرتا ننکو مہالکشمی پُل پر آیا، اور بائیں طرف کے زینے سے دھوبی گھاٹ میں اتر گیا۔

ننکو نے سوچا۔ کہیں کچھ نہیں بدلا ہے، شوشو کر کے کپڑے دھوتے دھوبی وہی ہیں، ناک سُڑکتے ننگ دھڑنگ بچے وہی ہیں، ٹی بی زدہ جوان بوڑھے وہی ہیں، شادی کے لئے اچھے ''بر'' کا انتظار کرنے والی دھوبیوں کی بیٹیاں اور بہنیں وہی ہیں، چوکھٹ پر اپنے شوہروں کا انتظار کرتی

دھوبنیں وہی ہیں، صرف منہ کے نوالے چھین لئے گئے ہیں۔ جوانی کے دور سے وہ یہی دیکھ رہا ہے۔ وہی کھولی ہے جس میں زندگی تنگ ہوتی جا رہی ہے، بچے بڑے ہو گئے ہیں، لیکن کام کرنے والے ہاتھ وہی ہیں۔ دو سے چار نہیں ہوئے۔

چاروں طرف رنگ برنگے کپڑے سوکھ رہے تھے، جیسے کسی چمن سے بہار گھاٹ میں اُتر آئی ہو، اس پُر بہار کو دیکھ کر ننکو نے سوچا۔ کب اپنی زندگی میں یہ رنگ اُتریں گے۔ وہ اپنی میلی ٹمیالی کھولی میں داخل ہو گیا۔ اسے لڑکا نظر نہ آیا تو پوچھا:

''کہاں گیا رام اوتار؟''

بیوی بولی:

''کام دیکھنے۔'' یہ سنتے ہی ننکو کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

کپڑوں کا گٹھر ایک طرف رکھ کر اس نے منہ ہاتھ دھوئے، بیوی نے پانی کا گلاس اور ایک تھالی میں دو روٹیاں اور آلو کی سبزی اس کے سامنے لا کر رکھ دی۔ ننکو نے کل بھی آلو کی سبزی کھائی تھی، اس نے بیوی کی طرف دیکھا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ بیوی اپنی بوسیدہ ساڑی سے ہوا کر رہی تھی!

پاربتی واشنگ مشین کے استعمال سے خفا تھی کیونکہ واشنگ مشین کے سبب ننکو کی روزی پر چوٹ پڑی تھی، ننکو جو اُسی کے گاؤں کا دھوبی تھا جس سے وہ گاؤں کے شب و روز پر کھل کر بات چیت کرتی تھی، لوگوں کے حال چال پتہ کرتی تھی۔ وہ ننکو کو اس وقت سے جانتی تھی جب اس کا بیاہ گاؤں میں ہی چندن جی سے ہوا تھا۔ سسرال میں بہو کی حیثیت سے اسے کپڑے بھی دھونا پڑتے تھے، کنویں سے پانی بھی کھینچنا پڑتا تھا، جانوروں کو چارہ دینا، دودھ دوہنا، نہلانا بھی پڑتا تھا۔ گوبر اور مٹی سے گھر لیپنا پڑتا تھا۔ اُپلے تھاپنے پڑتے تھے۔ چولہے میں آگ جلاتے پھونکتے اس کی آنکھوں میں پانی آ جاتا تھا اور آنکھوں میں سوزش ہونے لگتی تھی اور یہ اس وقت کی بات ہے جب گاؤں میں ہی رہ رہے تھے۔ پھر وہ بمبئی آئے، سانتا کروز میں گھر اور دکان خریدی۔ شیو جی کی کرپا سے دکان چلنے لگی، حالات سدھرے۔ لیکن ان کی بہو کو تو ہر چیز تیار ملا کرتی تھی۔ فریج کا ٹھنڈا پانی، دیوار میں ہاتھ لگاتے ہی روشنی، کپڑے دھونے اور سکھانے کے لئے مشین، موبائیل پر اپنے مائیکے والوں سے بات چیت، ٹی وی پر غلط سلط پروگرام دیکھنا اور غلط سلط سیکھنا، سیریلوں پر پڑوسیوں اور سہیلیوں سے باتیں کرنا اور نخرے بگھارنا، اپنے شوہر کو ''یار'' کہہ کر مخاطب کرنا، فلمی گانے گنگنانا، فلمی اور فیشن رسالوں

کا مطالعہ کرنا، شام ہوتے ہی آئینے کے سامنے کھڑی ہو جانا، سہیلیوں کے ساتھ فلم دیکھنے یا شاپنگ کرنے جانا۔ اپنے رشتے دار، احباب کے برتھ ڈے پر گلدستہ اور تحفہ لے جانا۔ اپنے یا شوہر کے برتھ ڈے پر سہیلیوں، دوستوں کو ہوٹل میں پارٹی دینا۔ کھانا پکانا بھی نہیں، رات کو شوہر کے ساتھ ہوٹل میں چائنیز، پیزا، برگر، پاستا، سینڈوچ و دیگر قسم کے کھانے کھانا۔ اکثر سنیچر کی رات Disco یا Pub میں شوہر اور دوستوں کے ساتھ ڈانس کرتے گزارنا۔ پھر ہفتے میں دو بار تنہا کٹی پارٹی میں سارا دن گزارنا۔ چھٹی کے دن شوہر، سہیلیوں اور دوستوں کے ساتھ آؤٹنگ یا پکنک پر جانا۔ اب دو چار دن سے تو جاگرز پارک میں جاگنگ کرنے کی بات کر رہی ہے۔ پاربتی سوچتی، بھگوان جانے اس گھر کا کیا ہوگا؟ کوئی اسے کچھ نہیں کہتا، ہوسکتا ہے اس کے گھر والوں نے ہم پر جادو ٹونا کر دیا ہو۔ میں نے ان سے کہا تھا دیکھی بھالی لڑکی سے شادی کرو، لیکن انہوں نے کہا جہیز اچھا دے رہے ہیں، برادری میں کافی نام ہوگا۔ میں ہوں تو اُن کا بھی ٹھور ٹھکانہ ہے، میرے جانے کے بعد کیا ہوگا، بھگوان جانے!

''کیا خاندان میں کوئی اور ایسی دھنوان بہو لایا ہے! یہ تو بھگوان کی کرپا ہے اور کچھ اپنا بھاگیہ اچھا ہے جو اتنی سوشل سگھڑ بہو ملی ہے۔ میری بھگوان سے پرارتھنا ہے کہ ہر کسی کو ایسی ہی بہو ملے۔ میں تو بھیل پوری والا ہوں اور منوج اکاؤنٹنٹ ہے، اسے میرا دھندہ پسند نہیں ہے۔ پھر ایک بار کہونگا کہ بھاگ اچھے ہیں۔''

کوشلیا کو گھر ایک پنجرے کی مانند لگتا، وہ کھلے آسمانوں میں اڑنے ہی کو زندگی سمجھتی تھی۔

اس دفعہ ننکو کافی دنوں بعد آیا تھا، پریشان نظر آ رہا تھا۔

ننکو نے کہا:

''کھار گیا تھا بیمار دوست سے ملنے۔ سوچا آپ سے بھینٹ کرتا چلوں۔''

بہو اندر کے کمرے میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ پاربتی نے بہو سے پانی لانے کے لئے کہا تو بہو ان سُنی کر کے ٹی وی دیکھتی رہی۔ پاربتی خود اٹھی، پانی لا کر دیا اور ننکو سے گاؤں کا حال چال پوچھنے لگی اور دبی زبان سے بہو کی شکایت کرنے لگی۔

بہو نے پروگرام دیکھ کر ٹی وی بند کیا تو دیکھا کہ ساس ننکو سے بڑے رازدارانہ انداز میں باتیں کر رہی ہے، بہو کو برا لگا۔ وہ دل مسوس کے رہ گئی۔ جب برآمدے میں آئی تو پاربتی چپ ہوگئی اور ننکو ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ پاربتی نے آہستہ سے ننکو سے کہا:

''ایک آدھ بال بچہ ہو جائے گا تو ساری پھیسن (فیشن) نکل جائے گی۔''

رات

کوشلیا نے اپنے شوہر منوج سے شکایت کی کہ ماں جی گھر کی باتیں ننکو سے کہہ دیتی ہیں۔ منوج یوں تو تھا جورو کا غلام پر شکایت پر اس نے کوشلیا کو سمجھایا کہ ننکوان کے گاؤں کا ہے، تو چنتا کیوں کرتی ہے، صبر سے کام لے بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا اور کوشلیا بہتر دنوں کے خواب دیکھتے دیکھتے سو گئی۔

صبح اچانک ننکو آیا اور پاربتی سے کہا کہ اس نے ہوٹل کے کپڑے دھو کر سکھائے تھے کہ دھوبی گھاٹ پر چرس اور گرد پینے والوں نے کپڑے چرا لئے، اب ہوٹل والوں کو کپڑے کی بھرپائی کرنا ہوگی۔ پیسے کہاں سے آئیں!''

پاربتی نے کہا:

''میں تجھے پانچ سو روپے دیئے دیتی ہوں کسی سے بتانا نہیں۔''

پاربتی نے ساڑی کی انٹی سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر ننکو کی جیب میں ڈال دیا، وہ نانا کرتا رہ گیا، تب پاربتی نے ادھر اُدھر دیکھ کر کہا:

'' تو میرا گاؤں والا ہے کیا تجھ پر میرا اتنا بھی حق نہیں؟ تو بعد میں آنا اور بھی پیسوں کا بندوبست کر دوں گی۔''

ادھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے پاربتی اسے سمجھاتے ہوئے بولی:

''چرسیوں اور گردالوؤں کو تم سب مل کر وہاں سے ہٹا کیوں نہیں دیتے؟''

''جھگڑا کون مول لے۔ پورے علاقے میں اندھیرا چھایا رہتا ہے مگر کسی کو چنتا نہیں! کیا کیا جائے!۔ کہتے ہیں یہ پورے ایشیا کھنڈ میں سب سے بڑا دھوبی گھاٹ ہے، اسے وِدیش سے کلنٹن اور پرنس چارلس صاحب بھی دیکھنے آئے تھے، کیا سوچ کر گئے ہوں گے!''

ایک شام۔

بہو اور بیٹا گھوم کر لوٹے تو McDonald's سے Pizza کا بکس بھی ساتھ لیتے آئے۔

چندن جی نے Pizza خوب مزے لے لے کر کھایا! تعریف کرتے رہے۔ ان کا یہ انداز پاربتی کو بالکل پسند نہ آیا۔ پاربتی نے اپنے حصے کا Pizza ''بعد میں کھاؤں گی'' کہہ کر رکھ دیا۔

دوسرے دن صبح کوشلیا نے Pizza کا ٹکڑا پڑے ہوئے پایا، اس پر چیونٹیاں چمٹی ہوئی تھیں۔ وہ بڑبڑائی:

''ماں جی! آپ نے Pizza کیوں نہیں کھایا؟''

پاربتی کچھ دیر تو خاموش بیٹھی رہی پھر چونک کر بولی:

''ارے! میں تو بھول ہی گئی تھی۔''

کوشلیا نے کہا:

''آپ نے جان بوجھ کر نہیں کھایا۔''

''ہاں ہاں! جان بوجھ کر نہیں کھایا، پھر......؟''

کوشلیا یہ سوچتے ہوئے اندر چلی گئی۔ کون جھگڑا کرے۔

...... پاربتی بھی جل بھُن کر رہ گئی۔

ایک ہفتے بعد ننکو پھر آیا تو پاربتی نے اسے پندرہ سو روپئے دیئے اور اس سے کہا کہ وہ دو دن بعد آئے، کوشلیا کل میکے جارہی ہے، مہینہ بھر وہ پونا میں رہے گی اور مہینہ بھر ننکو کپڑے دھوئے گا۔

ننکو خوشی خوشی چلا گیا۔

سارے راستے ننکو سوچتا رہا کہ سیٹھانی جی کے گھر کے کپڑے دھونے سے جو آمدنی ہوگی وہ اسے قرض میں ادا کرتا جائے گا! یہ سوچنا تھا کہ اس نے اپنے سر پر قرض کے بوجھ کو ہلکا ہوتا محسوس کیا۔

رات۔

کھولی میں ایک دیپک جل رہا تھا، کھولی کالی سی ہوئی جارہی تھی۔ کھولی میں جا کر ننکو نے کپڑوں کا گٹھر ایک طرف رکھا اور منہ ہاتھ دھوئے۔ ننکو کی بیوی اسٹو پر روٹیاں پکا رہی تھی۔ دو چار پرانے برتن اس کے اردگرد رکھے ہوئے تھے۔ پھر اس کی بیوی نے پیتل کا گلاس مانجھ کر اس میں پانی اور ایک تھالی میں دو روٹیاں اور آلو کی سبزی اس کے سامنے لا کر رکھ دی، ننکو نے کل بھی آلو کی سبزی کھائی تھی مگر خلافِ معمول آج اسے آلو کی سبزی مزیدار لگی اور اس نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔

بیوی ہمیشہ کی طرح اپنی بوسیدہ ساڑی سے ہوا کرتی رہی اور ننکو سوچتا رہا کہ جلد ہی وہ بیوی

کے لئے نئی ساڑی خرید لائے گا۔

آج اسے لڑکا کھولی میں نظر نہ آیا تو اس نے بیوی سے پوچھا بھی نہیں کہاں گیا رام اوتار؟

دو دن بعد۔

ننکو، پاربتی کے گھر پہونچا اور کال بیل بجائی۔

دروازہ کھلا، سامنے کوشلیا کھڑی تھی۔

کوشلیا کو دیکھ کر ننکو چونک گیا! چہرے کی خوشی غائب ہوگئی۔ اس نے تو سوچا تھا کہ سیٹھانی جی دروازہ کھولیں گی!

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ننکو نے پوچھا:

''سیٹھانی جی!''

ناگواری کے تاثرات چہرے پر لاتے ہوئے کوشلیا نے کہا:

''مائیکے گئی ہیں''

''کب واپس لوٹیں گی؟''

''پتہ نہیں''

ننکو مایوسی سے صرف اتنا کہہ پایا:

''اچھا! سیٹھانی جی آئیں تو ان سے کہنا، ننکو آیا تھا۔''

وہ مڑا اور اس کے پیچھے کوشلیا نے بڑی زور سے دروازہ بند کر دیا۔

☆☆☆

یہی تو زندگی ہے :

''بیوی کٹی پارٹی میں، شوہر کسینو میں، بیٹے بیٹیاں ریو پارٹی میں، یہی تو زندگی ہے!''

یک سطری کہانی - ع.ع.خ

کھول دوں تو؟

ایک شام انیل اپنی بچی کی دوا لانے جارہا تھا کہ اچانک اسے مارکیٹ کے قریب ارمیلا نظر آ گئی۔

"آؤ سامنے کے ریسٹورنٹ میں ایک ایک کپ کافی پئیں۔"

"چلو، مگر تمہیں کوئی کام تو نہیں؟"

"ہوا بھی تو کیا! تم مل گئی ہو چلو بیٹھیں گے کچھ دیر۔"

ریسٹورنٹ میں کافی بھیڑ تھی۔ ویٹر انیل کو جانتا تھا اس نے ایک گوشے میں ان کے لئے میز کا بندوبست کر دیا۔

قریب گھنٹے بھر وہ وہاں بیٹھے رہے۔ ارمیلا کا نرم گداز ہاتھ انیل نے جب اپنے ہاتھ میں لیا تو محسوس ہوا کہ اس کی نس نس میں آگ سی بھڑک رہی ہے۔ اسے پتا تھا ارمیلا کوئی ساوتری نہیں ہے۔ اور اُرمیلا بھی جانتی تھی کہ انیل کوئی ستیہ وان نہیں ہے۔

انیل نے شوق کی خاطر نوکری کی تھی۔ اسے ڈرامے ڈائریکٹ کرنا پسند تھا۔ چنانچہ اس نے کوشش کر کے ایسے بینک میں ملازمت حاصل کی تھی جہاں ڈراموں کو بڑھاوا دیا جاتا تھا۔

جلد ہی اس کا ایک ڈرامہ اسٹیج ہونے والا تھا۔ اس کے تمام آرٹسٹ منجھے ہوئے اور تجربہ کار تھے۔ ان میں اُرمیلا بھی تھی۔ اس نے کئی ڈراموں میں حصہ لیا تھا اور اچھی خاصی اداکاری کر لیتی تھی۔

اکثر انیل کے آگے پیچھے گھومتی رہتی۔ اس کی آواز تو خاص نہیں مگر فیگر اچھا تھا، برتاؤ میں کافی بولڈ اور فری تھی۔

ارمیلا کی شادی ایک ٹیچر سے ہوئی تھی مگر وہ جلد ہی بیوہ ہوگئی تھی۔ بڑی تکلیفوں میں اس کے دن کٹنے لگے۔ پھر اس نے ایک مالدار مگر بوڑھے رنڈوے سے شادی کر لی۔ بوڑھے کے تین جوان بیٹے تھے۔ شوہر کے انتقال کے بعد دولت کا ایک بڑا حصہ ارمیلا کو بھی ملا۔

ایک مرتبہ ارمیلا ریہرسل پر نہ آئی تو انیل اس کے گھر چلا گیا اور پھر اکثر جانے لگا!

''تم مجھے اچھے لگتے ہو!'' ارمیلا نے کہا۔ پھر تو ملنا روز کا معمول ہوگیا۔ اگر کسی شام ریہرسل نہ ہوتی تو وہ فلم دیکھنے چلے جاتے۔ آدھی رات کو اسے پہنچانے انیل اس کے گھر جاتا اور پھر بھاری قدموں سے واپس لوٹتا۔

''ہماری یہ دوستی تمہاری بیوی کو ناپسند تو نہیں؟'' ایک دن اُرمیلا نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔''

''مجھے یہ سچ نہیں لگتا!''

''واقعی مجھے نہیں معلوم، اس نے مجھ سے اس تعلق سے کچھ نہیں پوچھا، وہ کافی سرد ہے۔''

''آئی سی! تم جیسا اسمارٹ آدمی سامنے ہوتے ہوئے کوئی عورت سرد کیسے رہ سکتی ہے؟ مجھے نہیں لگتا۔ ہوسکتا ہے وہ تم سے خوفزدہ ہو؟''

یہ سچ تھا۔ سیدھی سادی کرونا معمولی شکل وصورت کی تھی۔ مڈل کلاس پاس۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد کسی رشتے دار کے گھر پروان چڑھی تھی۔

ایس ایس سی کرنے کے بعد انیل کے والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ ماں تو پہلے ہی فوت ہو چکی تھی۔ پھر بھی بڑی محنت سے اسے نے ڈگری حاصل کی۔ والد ورثے میں ایک بڑا مکان اور خاصا بینک بیلنس چھوڑ گئے تھے۔ اس نے پرانا مکان بیچ کر ایک اچھا سا نیا مکان بنایا۔ اسمارٹ انیل شادی کے لئے کرونا جیسی ہی سیدھی سادی لڑکی چاہتا تھا۔ امیر گھرانوں کی لڑکیاں تو بہت تھیں جو انیل کے لئے آس لگائے بیٹھی تھیں لیکن کرونا اسے پسند آئی تھی۔ انیل اس احساس کا شکار تھا کہ غریب لڑکی کو امیر ماحول دے کر وہ اس پر احسان کر رہا ہے۔ مگر شادی کے بعد اسے ایک زبردست شاک لگا جب اسے پتہ چلا کہ کرونا ایک دم سرد تھی۔ ایک دم ٹھنڈی۔ وہ چاہتا تھا کرونا اس سے پیار کرے، ضد کرے۔ مگر بے سود۔ صبح کرونا نہ جانے کب اٹھ جاتی اور کام میں لگ جاتی اور دن بھر لگی رہتی۔

''مجھے بھی صبح صبح کیوں نہ جگا دیا؟''

''جلدی جگانے پر آپ کو غصہ آ جاتا ہے اس لئے آواز نہیں دی۔''

''کیا ہو جاتا اگر میں تھوڑا غصہ ہو جاتا؟''

انیل اس کا ہاتھ پکڑتا وہ کانپنے لگتی۔

ایک دن انیل آفس سے جلد گھر آ گیا۔

''یہ کیا اتنی جلدی آ گئے آپ؟'' وہ اٹھ کھڑی ہو گئی۔ انیل نے کچھ نہیں کہا۔ دروازہ بند کیا اور کرونا کو اپنی طرف کھینچا۔ مگر وہ مچلنے لگی۔

''پاگل ہو گیا؟ تمہارے لئے میں جلد گھر آیا اور تم............''

''چھوڑیئے مجھے، پڑوسن کے بنگلے کی موسی کے یہاں مجھے پاپڑ بیلنے جانا ہے ابھی تھوڑی ہی دیر میں وہ آواز دیں گی۔''

''آواز دی بھی تو جواب نہیں دینا...... سمجھیں؟''

انیل کا جملہ سنتے ہی وہ کھڑکی سے باہر سر نکال کر کہنے لگی،

''موسی، موسی جی! میں تیار ہوں ابھی آئی۔'' اور وہ چلی گئی۔

غصے میں انیل سیدھا باہر نکلا اور ایک سنیما ہال میں جا کر بیٹھ گیا۔ فلم اتفاق سے کافی بولڈ اور سیکسی تھی۔ وہ اور سلگ اٹھا۔

فلم چھوٹنے کے بعد وہ دیر تک بھٹکتا رہا۔ کاش! اس رات اسے ارمیلا مل جاتی!

اس واقعے کے بعد پندرہ روز تک وہ الگ کمرے میں سوتا رہا۔ مگر کرونا نے کبھی پوچھا بھی نہیں کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔

وہ کرونا کو اچھی طرح سے اکساتا لیکن وہ پتھر بنی رہتی۔

اسے ارمیلا کی بات یاد آ گئی، ہو سکتا ہے وہ خوف زدہ ہو! وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا، کیا کرونا واقعی خوفزدہ ہے؟

انیل کرونا کو لے کر فیملی ڈاکٹر کے پاس بھی گیا۔ فیملی ڈاکٹر نے گائناکولوجسٹ اور سائیکیاٹرسٹ کے نام چھٹی دی تھی۔ نفسیاتی معالج کی تشخیص کے مطابق کرونا اور اس کے خاندانی پس منظر بہت مختلف تھے اور دونوں کی پرورش کے بیچ زبردست کھائی تھی اس لئے کرونا اس سے بے تکلف نہیں ہو پاتی تھی اور کتراتی تھی۔ اگر یہ کھائی کچھ کم ہوتی تو ممکن تھا کہ کرونا کا رویہ انیل کے مزاج کے

کسی حد تک موافق ہوتا اور تب کرونا انیل کے مزاج پر کھری اترتی۔

نفسیاتی علاج ہوا اور شادی کے پانچ سال بعد کرونا کا پیر بھاری ہوا۔ وہ بچوں کی تصویروں میں زیادہ مگن رہنے لگی۔ ٹوپی، موزے، نہالچے سیتے ہوئے بیٹھنا اسے بھانے لگا۔

لیکن معینہ مدت سے پہلے ہی بچی پیدا ہوئی جو پیروں سے معذور تھی۔ کرونا ہمیشہ بچی کے متعلق فکر مند رہتی۔ وہ اسے پیار تو کرتی تھی مگر اس میں دلار کم فکر زیادہ ہوتی۔ وہ کمزور ہوتی چلی گئی۔ انیل کے لاکھ سمجھانے پر بھی وہ کھوئی کھوئی سی رہا کرتی۔ اسے بخار بھی رہنے لگا۔ علاج ہوتا رہا مگر کرونا کو نہ رہنا تھا نہ رہی۔ بچی کی پیدائش کے چھ مہینے بعد ہی وہ اس دنیا سے کوچ کر گئی۔ انیل نے ایک بوڑھی آیا کو بچی کی دیکھ بھال کے لئے رکھ لیا۔ بچی سال بھر کی ہوگئی مگر نہ بستر پر پلٹ سکتی تھی اور نہ پوری آواز کے ساتھ رو سکتی تھی۔

دن گزرتے رہے۔

بچی کی دیکھ بھال کرتے کرتے بوڑھی آیا بھی تھک جاتی۔ وہ زیادہ تنخواہ لے کر بھی کام کرنا نہیں چاہتی تھی مگر بچی کی کشش نے اسے مجبور کر رکھا تھا۔ ادھر انیل بھی آفس سے لوٹتا تو جیسے گھر میں پھنس جاتا۔ اس نے تمام چھٹیاں اپنی اپاہج بچی کے لئے ختم کر ڈالی تھیں۔

علاج جاری تھا۔

لیکن ایک دن بچی کو تیز بخار آیا اور بڑی شدت سے کھانسی آنے لگی۔ سینہ دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ ڈاکٹر نے اسے جانچا اور کہا:

"لاپرواہی مت برتیئے نمونیا کا ڈر ہے۔"

ڈاکٹر نے ایک انجکشن لگایا اور کچھ دوائیں لکھ کر دیں۔

اسی شام بچی کو بوڑھی آیا کے حوالے کر کے وہ دوا لانے جا رہا تھا کہ اچانک اسے مارکیٹ کے قریب ارمیلا نظر آ گئی۔

جب وہ گھر لوٹا تو حد درجہ مسرور تھا۔

بوڑھی آیا نے جب دوا سے متعلق پوچھا تو انیل کو جھٹکا سا لگا کہ وہ کیمسٹ کی دکان پر گیا ہی نہیں۔ لیکن واپس جانے کی اس میں سکت نہ رہی تھی۔ ریسٹورنٹ کے ایر کنڈیشنڈ ہال میں بہت دیر تک بیٹھے رہنے سے اس کے گھٹنوں میں درد ہونے لگا تھا۔ اس نے بوڑھی آیا کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ

ڈاکٹر کی لکھی ہوئی دوا نہیں ملی اور تعجب کہ اس رات بچی بھی آرام سے سوئی۔

دو دن بعد ارمیلا انیل سے ملنے اس کے گھر آئی۔ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ بچی اور بوڑھی آیا پچھلے کمرے میں تھے اور دونوں برآمدے ہی میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

''تمہاری بیوی کا انتقال ہوا مگر تم نے مجھے بتایا تک نہیں۔''

''کیا بتاتا؟''

''میں چاہتی ہوں کہ تمہارا گھر بسا لوں۔''

''کیا سچ! تم نے تو میرے منہ کی بات چھین لی، میرا تو یہ خواب ہے!''

اور اسی وقت اتفاق سے بوڑھی آیا روتی ہوئی بچی کو انیل کے پاس لے آئی۔

''یہ کون ہے؟''

اس سے پہلے کہ انیل کچھ کہتا بوڑھی آیا نے کہا:

''صاحب کی بچی ہے۔''

انیل بوڑھی آیا کو گھورنے لگا۔

''تم تو کہتے تھے کہ تمہاری بیوی سرد تھی؟ اس سے تمہارا جسمانی تعلق نہیں تھا پھر یہ کیا ہے؟ تم جھوٹ بھی بولتے ہو؟''

یہ کہہ کر ارمیلا اٹھی اور باہر نکل گئی۔ انیل اسے پکارتا ہی رہ گیا۔ پھر وہ بوڑھی آیا پر برس پڑا لیکن بچی کا خیال آتے ہی اسے بوڑھی آیا سے معافی مانگنی پڑی۔

اگلے دن انیل ارمیلا کے گھر گیا تو ارمیلا نے نخوت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا:

''مجھے سنسار چاہئے صرف تمہارا اور میرا، بچی کے ساتھ میں جھوٹا پیار نہیں کر سکتی...... مجھ سے کسی کے لئے یہ نہیں ہوگا، میں صرف تمہیں چاہتی ہوں۔''

''مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت دو۔''

ارمیلا نے کچھ نہیں کہا۔ تھوڑی دیر انیل وہاں بیٹھا رہا، چائے میز پر ٹھنڈی ہوتی رہی اور پھر انیل اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ ارمیلا نے اسے روکا بھی نہیں۔

اسی دن بچی کی طبیعت پھر خراب ہوگئی۔
کھانسی بڑھ گئی۔ سانس تیز تیز چلنے لگی۔
ڈاکٹر کو فون کیا۔
ڈاکٹر آیا۔ بچی کو جانچا اور الگ لے جا کر ہلکی آواز میں بولا:
''سنبھالئے۔ بہت احتیاط برتیئے۔ ہوا ذرا بھی نہ لگنے پائے، ڈبل نمونیا ہوگیا ہے۔''
رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ باہر ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ جس کمرے میں بچی سوئی تھی وہاں کھڑکیاں اچھی طرح بند تھیں۔ بوڑھی آیا سو گئی تھی۔
انیل کو ڈاکٹر صاحب کی ہدایت یاد آئی۔
''.........ہوا ذرا بھی نہ لگنے پائے.........''
اچانک انیل کے دل میں خیال آیا۔ کھڑکی کا ایک پٹ ذرا سا کھول دوں تو؟''

☆☆☆

قاتل :

'' تمہاری انگوٹھی قبول نہیں کرسکتی، اُس کے کھونے پر شیکسپیئر کے جنونی اوتھیلو کی طرح کہیں تم بھی قاتل بن گئے تو؟''

یک سطری کہانی - ع.ع.خ

اور بجو کا ننگا ہو گیا!

دیوان پشتینی امیر تھا۔ ممبئی میں اس کی تین پیڑھیاں رہ چکی تھیں۔ زویری بازار میں ان کی سونے چاندی کی دکان تھی۔ مہیش کا پتا آج شہر کا امیر ترین شخص تھا لیکن بیس برس پہلے غریب تھا۔ اس کے بڑے بھائی نے داداگری اور غنڈہ گردی کے ذریعے کافی دولت اکٹھا کر لی تھی۔ ممبئی میں اس کے کئی کلب چلتے تھے۔ آ کاش کے باندرہ اور جوہو میں دو تھری اسٹار ہوٹل بھی تھے۔

یہ تینوں نوجوان وقت گزارنے کے لئے یونیورسٹی کیمپس کالینہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ روزانہ Scorpio (اسکارپیو) میں گھومتے، وائلڈ پارٹی، پرائیویٹ بوزِنگ پارٹی، ریو پارٹی، پب، ڈسکوائٹینڈ کرتے اور ہر طرح کی منشیات کا نشہ کرتے، لڑکیوں سے ڈیٹنگ کرتے، مار پیٹ کرتے، جو چیز پسند آئے اسے خرید لینے یا چھین کر حاصل کرنے کا تینوں کو جنون تھا۔ پھر وہ چاہے جو چیز بھی ہو۔

ہمیشہ کی طرح وہ آج بھی دیوان کی Scorpio (اسکورپیو) میں خوش گپیاں کرتے، گاتے بجاتے بھائیندر کی طرف جا رہے تھے۔ بھائیندر سے مغرب میں مڑ کر وہ اُتن کی طرف چلے گئے۔ اُتن مچھلی والے کرشچینوں کا گاؤں ہے۔ چاروں طرف پہاڑ تھے۔ کھاڑی میں مچھلی پکڑنے کی کشتیاں کھڑی تھیں۔ دور دور تک نمک کے ڈھیر نظر آرہے تھے۔ آبادی سے صرف دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہرے بھرے کھیت تھے، وہ اس طرف نکل گئے۔

شام کے آثار نظر آنے لگے۔ انہوں نے ایک طرف سڑک پر اپنی گاڑی کھڑی کر دی اور اتر

کر کھیتوں میں گھستے چلے گئے۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' مہیش نے دریافت کیا۔

''بس! ٹائم پاس، کوئی ارادہ نہیں، کوئی منزل نہیں۔'' دیوان نے جواب دیا۔

''اچھا ہے۔ نو ٹینشن، لائف اِز فار انجوائے مینٹ'' آکاش نے ہنستے ہوئے کہا۔

''باپ کی کمائی ہے تو فکر کس بات کی۔'' مہیش پھر بولا۔

تینوں ہنسنے لگے۔

وہ کھیت میں دور تک چلتے چلے گئے۔

شام کا سرمئی رنگ کھلیان اور فارم ہاؤس کے ارد گرد چھانے لگا تھا۔ انہیں ایک دیہاتی لڑکی نظر آئی جو آم کے ایک درخت کے نیچے کھڑی کچے آموں کو پتھر کا نشانہ بنا رہی تھی۔ جب وہ درخت پر پتھر مارتی تو اس کا جسم کسی نازک شاخ سا لچک لچک جاتا۔ وہ بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔ اس نے درخت کے نیچے ایک بڑے سے رومال میں بہت سے کچے آم جمع کر لئے تھے۔

آکاش، دیوان اور مہیش نے لڑکی کو دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ کنوئیں سے پانی کھینچ کر ورزش کرنے والی لڑکی کے جسم کی بو باس کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ وہ تینوں اس کے قریب پہنچ گئے۔ لڑکی کچے آم توڑنے میں لگی تھی۔ تینوں اسے تقریباً گھور رہے تھے۔ لڑکی بھی انہیں ایک کچے آم کی طرح نظر آنے لگی۔ لڑکی کے بال چوٹی میں گندھے ہوئے تھے۔ کھلے منہ میں اس کے سفید دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ پاؤں ننگے تھے۔ دیوان سوچنے لگا یہ کون سا ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتی ہوگی، یہ کس صابن سے نہاتی ہوتی! شہر کی خوشبوؤں میں بسی لڑکیوں سے یہ دیہاتی لڑکی کتنی الگ لگ رہی تھی!

تینوں جیسے ہی لڑکی کے قریب آئے، لڑکی نے بڑی بڑی پلکیں اٹھا کر حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ افق پر سورج ابھی مکمل طور پر نہیں ڈوبا تھا۔ شفق کی لالی آسمان پر پھیلی ہوئی تھی۔ لڑکی نے ان لڑکوں کی طرف دیکھا تو مگر وہ ان کی آنکھوں میں مچلتے ہوس کے شیطان کو نہیں دیکھ سکی یا دیکھا تو پہچان نہیں سکی۔ بچوں جیسی مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔

''کیا کر رہی ہو؟'' آکاش نے پوچھا۔

''دیکھ نہیں رہے ہو، میں کچے آم توڑ رہی ہوں۔''

"یہ سب آم تم نے ہی توڑے ہیں؟" مہیش نے پوچھا۔

لڑکی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کتنے میں دوں گی؟" دیوان نے سوال کیا۔

"مطلب۔ایسے ہی لے جاؤ، مفت میں۔"

"مفت میں نہیں لیں گے، کچھ نہ کچھ پیسے دیں گے۔"

لڑکی نے تینوں پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور پوچھا:

"کہاں سے آئے ہو؟"

"ممبئی سے......" مہیش نے کہا۔

"ممبئی تو بہت بڑی ہے۔" لڑکی نے بھول پن سے کہا۔

"کالینا سے......" دیوان نے جواب دیا۔

لڑکی نے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا:

"اسی لئے ہر چیز کی قیمت چکانا چاہتے ہو۔تم شہری لوگوں کو ہر چیز پیسوں سے خریدنے کا جنون ہوتا ہے۔"

آکاش نے پلٹ کر کہا:

"تم کبھی ممبئی گئی ہو؟"

"ہاں! پچھلے سال ماما کے ساتھ گئی تھی۔مگر مجھے وہاں اچھا نہیں لگا۔میں تو یہاں چڑیوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔کچے آم توڑنا چاہتی ہوں، سُوریودے اور سُوریاست دیکھنا چاہتی ہوں۔کیا تم یہ سب پیسوں سے خرید سکتے ہو؟"

تینوں لڑکے، لڑکی کے بھولے پن پر ہنسے اور اس کے گدرائے جسم کو آنکھوں میں نگلنے لگے۔

لڑکی نے پوچھا:

"کیا کبھی تاروں سے بھرا آسمان دیکھا ہے؟ صاف ستھرے پانی والی ندیاں دیکھی ہیں؟"

دیوان نے سوچا، لڑکی سمجھدار ہے صرف چہرے پر بھولا پن ہے۔مہیش نے سوچا، شہر والوں کو دیہات کے حسن کا کوئی اندازہ نہیں، کاش! وہ لوگ دیہاتی حسن کا مطالعہ کرتے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" آکاش نے پوچھا۔

''میرا نام چنکی ہے۔''

''تمہارا گھر کہاں ہے؟''

''اُس پہاڑی کی اوٹ میں۔''

''شام ہوگئی ہے۔تم گھر کب جاؤ گی؟''

''شام ہو جائے گی تو پھر رات آئے گی۔تارے چمکیں گے، چاند نکلے گا،اسی کی چاندنی میں چلی جاؤں گی۔''

''کیا تمہیں جنگلی جانوروں سے ڈر نہیں لگتا؟''

''نہیں۔''

''اور انسانوں سے؟''

''لگتا ہے۔''

''کیا تمہارے ماں باپ تمہارا انتظار نہیں کر رہے ہیں؟''

''بالکل کر رہے ہیں، میں یہ آم لے کر چلی جاؤں گی۔''

''آم کا کیا کرو گی؟''

اس سوال پر وہ زور سے ہنسی،اس کے دانت موتی کی طرح چمکے۔اس نے تینوں کی طرف دیکھ کر کہا:

''پاگل ہو تم،اتنا بھی نہیں سمجھتے،میری ماں ان کچے آموں کی چٹنی بنائے گی۔''

''اگر ہم تمہاری چٹنی بنائیں تو؟'' دیوان نے لڑکی سے پوچھا۔

اس دفعہ لڑکی اُس کی آنکھوں میں چھپے ہوس کے جانور کو پہچان گئی۔وہ بھاگ کر درخت کے پیچھے چلی گئی۔

آکاش اور مہیش نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔اور درخت کے پیچھے جا کر لڑکی کو پکڑ لیا۔پھر دیوان نے لڑکی کے منہ میں رومال ٹھونس دیا اور گال پر دو چار چانٹے رسید کیے۔لڑکی کانپنے لگی۔اس کی آنکھوں میں خوف در آیا،وہ کبھی پہاڑ کی طرف جس طرف اس کا گھر تھا، کبھی سڑک کی طرف دیکھنے لگتی مگر دور دور تک کوئی نہ تھا۔

سورج ڈھل چکا تھا۔مہیش نے لڑکی کے سینے سے چاقو لگا دیا۔وہ اور ڈر گئی۔وہ اسے کاندھے پر لاد کر جھاڑیوں کے پیچھے لائے۔قریب کے کھیت میں بجوکا کھڑا تھا۔

جب وہ تینوں فارغ ہوئے تو لڑکی بے ہوش ہو چکی تھی۔ دیوان نے لڑکی کی شلوار قمیص دور اچھال دیئے جو ایک جھاڑی سے جا کر لٹک گئے۔ پھر وہ تینوں وہاں سے اتنی تیزی سے نکلے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

سڑک پر کھڑی Scorpio میں بیٹھے اور تیز رفتاری سے شہر کی طرف چل دئے۔

بجوکا کھیت میں کھڑا تھا۔

چاند اپنی چاندنی بکھیر رہا تھا۔

لڑکی کو ہوش آیا تو وہ کسمسا کر اٹھ بیٹھی، اس کا سر گھومنے لگا۔ وہ کھڑی ہوئی مگر پھر چکرا کر گر پڑی۔ اس نے دیکھا کہ وہ پوری طرح برہنہ ہے۔ اس کے بدن میں درد کی لہر اٹھی، اس کے دل نے کہا کہ وہ لُٹ چکی ہے اور اب اپنے گھر واپس جانے کی حالت میں نہیں ہے۔ ہمت بٹور کر وہ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنے کپڑے تلاش کئے مگر کپڑے اسے نہیں ملے۔

تب ہی کوئی بڑا سا پرندہ خوفناک آواز میں چیختا ہوا اس کے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ وہ سہم گئی۔

دودھیا چاندنی میں اس کا بدن اب بھی دمک رہا تھا۔

دور سڑک پر سے اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔

چاروں طرف سناٹے کا راج تھا۔ صرف بجوکا کھیت میں خاموش کھڑا اسے تک رہا تھا۔ لڑکی دوڑ کر بجوکا سے لپٹ گئی۔ بجوکا میں جیسے جان آ گئی۔ وہ ہلنے لگا جیسے لڑکی کو دلاسہ دے رہا ہو۔

لڑکی نے بجوکا کے کپڑے اُتار لئے اور......اور بجوکا ننگا ہو گیا!

☆☆☆

انصاف :

''کیا یہ ضروری ہے کہ عورتیں کھلے عام کپڑے اُتاریں کہ انہیں انصاف ملے؟!''

یک سطری کہانی - ع.ع.خ

سونے کی فِش پلیٹ

زلزلہ زدہ علاقوں سے ممبئی آئے ہوئے خاندانوں کو امید تھی کہ یہاں آسمان بدل جائے گا مگر وہ مزید پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے۔ سامان زیادہ نہیں تھا۔ کپڑے اور ضروری اشیاؤں سے بھرا ایک پرانا صندوق تھا جنہیں وہ گاؤں سے لائے تھے، کچھ برتن وغیرہ ایک بورے میں بندھے تھے، صندوق وشواس نے اٹھالیا تھا۔ ماں نے برتن کا بورا اٹھا رکھا تھا، بوڑھے باپ کی طبیعت خراب تھی اور بہن شردھا جو صرف تیرہ سال کی تھی بیمار رہتی تھی۔

انہوں نے وکھرولی میں ایک زیر تعمیر عمارت کے سامنے خالی پڑی ہوئی زمین پر جھونپڑا بنالیا۔ سامنے ریلوے لائن تھی اور وہیں بڑا سا نالہ بہتا تھا۔ استعمال کے لئے پانی وہ زیر تعمیر بلڈنگ کے چوکیدار سے مانگ لیتے جو ان کے ہی گاؤں کا تھا۔ مٹی کے چار ٹوٹے پھوٹے مٹکے بھی اس کی مہربانی سے مل گئے تھے، جنہیں ماں پانی سے بھر کر رکھ دیتی تھی۔ ابھی تعمیر کا کام مکمل طور پر شروع نہیں ہوا تھا، چوکیدار نے انہیں کام پر لگا دینے کا وعدہ کیا تھا مگر سوال تھا کہ تب تک کیا کریں؟ روز کے کھانا کھانے کے اور باپ کی دوا کے پیسے کہاں سے آئیں؟

ایک دن بچت کے سارے پیسے ختم ہو گئے، اسی دن سے فاقے شروع ہوئے۔

وشواس نان میٹرک تھا۔ وہ نوکری کی آس میں دن بھر گھومتا، ہوٹل میں ٹیبل والے کا کام

کرنے یا مارکیٹ میں حمالی کرنے میں اسے شرم آتی تھی۔ جب فاقوں کی مار سہی نہ گئی تو حمالی بھی کی، لیکن ایک دن اس کے ہاتھ سے کسی کا ایک صندوق گر پڑا، اس میں رکھے کانچ کے برتن ٹوٹ گئے، ایک دو تھپڑ اور گالی کھا کر وہ واپس آ گیا۔ اس کے باوجود دکاندار نے اسے دو روپے دیئے۔

وشواس دن بھر کا تھکا جب جھونپڑے پر پہنچا تو روٹی کی سوندھی بو آ رہی تھی۔ شاید ماں نے کہیں سے کچھ انتظام کر لیا تھا۔ اس نے دیکھا اندر مٹی کے تیل کا دیا جل رہا تھا اور ماں باپ اور شرڈھا نیم دائرے میں بیٹھے جلدی جلدی کھانا کھا رہے تھے۔ وشواس جب اندر پہنچا تو کھانا ختم ہو چکا تھا۔ اس نے پیٹ بھرا ہونے کا بہانہ کیا اور پانی پی کر سو گیا۔

وشواس کو ریلوے لائن پر فش پلیٹ تبدیل کرنے کا کام مل گیا، چالیس روپے روز پر، لیکن اس نے اس بارے میں کسی سے کچھ نہ کہا۔

صبح جب وشواس ایک سڑک سے گزر رہا تھا کہ کسی راہگیر کا پرس جیب سے گر گیا، اس نے پرس دیکھا، اٹھایا اور سوچنے لگا کہ پرس گرا تھا یا جان بوجھ کر گرا دیا گیا تھا؟ فلمی سین کی طرح!

وشواس نے پرس اس آدمی کو دے دیا جس کا وہ تھا، اس آدمی نے اسے شاباشی دی اور پوچھا کہ وہ کیا کرتا ہے؟

وشواس نے جب اپنی نوکری کے بارے میں بتایا تو اس آدمی نے اسے پچاس روپے کے نوٹ کے ساتھ اسے اپنا وزیٹنگ کارڈ بھی دیا۔ فلمی سین کی طرح۔ وشواس نے کارڈ پر پتہ پڑھا۔ پتہ دکھرولی کا تھا، اس آدمی کا نام ڈیوڈ تھا۔ اس نے کہا:

''میرے ساتھ آ جاؤ، میں تمہیں سونے کی لائن کی فش پلیٹ بدلنے کا کام سکھا دوں گا۔''

جب وشواس دیئے ہوئے پتے پر پہنچا تو ڈیوڈ کے ارد گرد کئی لڑکے اور ادھیڑ عمر کے افراد جمع تھے، دو ایک لڑکے اس کی ٹانگیں دبا رہے تھے اور وہ چلم سے چرس کا دم مار رہا تھا۔ ڈیوڈ نے وشواس کو رگھو کے حوالے کیا۔ پتہ چلا کہ وہ لوگ جیب کترے اُچکّے ہیں اور مہینے بھر کی ٹریننگ میں رگھو، وشواس کو یہ ہنر سکھا دے گا۔

وشواس اُس دن رگھو کے ہاتھ کی اور دانتوں کی صفائی دیکھتا رہا، رات میں جاتے ہوئے

رگھو نے وشواس کو ڈیوڈ کے کہنے پر پھر پچاس روپے دیے۔

جب وشواس جھونپڑے پر پہنچا تو ماں نے نوکری کے بارے میں پوچھا:

''وشواس! تیری نوکری کا کیا ہوا؟''

وشواس نے کہا:

''ماں! مجھے ریلوے لائن پر فش پلیٹ تبدیل کرنے کا کام مل گیا ہے۔ چالیس روپے روز پر۔''

مگر ماں کے جملے نے اسے جھنجھوڑ دیا:

''وشواس! تجھے نوکری لگی، پھر بھی تو اپنی کوشش میں کمی مت آنے دینا، چالیس روپے میں کیا ہوتا ہے۔''

ماں نے پرماتما سے دن بھر دعائیں مانگی تھیں۔ باپ نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ وشواس نے ماں باپ کی آنکھوں میں حسرت اور خوشی کی ملی جلی چمک دیکھی۔ اس نے سوچا۔ اگر وہ حقیقت بتا دیتا ہے تو ماں باپ کی خوشی پل بھر میں ختم ہو جائے گی۔ اس کے منہ سے نکلا:

''ماں! جو نوکری مجھے ملی ہے وہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ ترقی ملنے میں زیادہ دن نہیں لگیں گے۔''

باپ نے اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں، دوائی کا بندوبست تو اب ہو ہی جائے گا! ماں نے اس کی بلائیں لیں اور ایک بار پھر پرماتما سے دعائیں مانگیں کہ وشواس کی جلدی ترقی ہو جائے۔

رات وشواس کو دیر تک نیند نہ آئی، یہ کام اس کے ضمیر کو گوارہ نہ تھا، لیکن وہ ضمیر کے سہارے اور کتنے دن بے کار رہ سکتا تھا؟ لیکن اسے کبھی جیب کاٹتے ہوئے، موبائیل فون اڑاتے ہوئے یا دانتوں کے ذریعہ گلے سے چین کاٹتے ہوئے پکڑے جانے پر لوگوں کی مار پیٹ اور برہنہ کر کے بھگانے کا منظر یاد آتا، کبھی پولس کے ڈنڈے لات گھونسے اور تھرڈ ڈگری کا استعمال، کبھی جیل کی بند سلاخیں تو کبھی پیسوں سے بھرا پرس، قیمتی موبائیل فون اس کی آنکھوں کے آگے فلمی منظر کی طرح گھومنے لگتے۔

رات کئی بار وشواس کی نیند ٹوٹی، اس نے کئی بار سوچا کہ ماں کو سب کچھ سچ سچ بتا دے مگر باپ کی بیماری کا خیال آیا اور اُس نے اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ دیا۔

''کیا بات ہے وشواس، طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا؟'' ماں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں ماں!'' وشواس نے کہا۔
''تو جاگ کیوں رہا ہے۔ سو جا بیٹا، کل کام پر جانا ہے۔''

وشواس روز رگھو کے ساتھ گھومتا، کبھی بس میں، کبھی لوکل ٹرین میں، کبھی بھیڑ بھرے بازاروں میں اور رگھو کے ہاتھ یا دانتوں کی صفائی پرکھتا، وشواس تیزی سے ہنر سیکھنے لگا۔ مہینے بھر کی ٹریننگ وشواس نے ڈھائی تین ہفتوں میں مکمل کر لی اور اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا، اب وہ اکیلا ہی اپنا کام کر سکتا تھا، بڑی صفائی کے ساتھ بلا جھجک وہ اب لوگوں کے پرس، موبائیل فون اور ان کے گلوں سے چین، منگل سوتر کے علاوہ کانوں سے بالیاں اور ایئر رنگس اڑانے لگ گیا تھا۔ وہ جتنی قیمتی شئے اڑاتا اس کی آدھی رقم اسے مل جاتی اور آدھی ڈیوڈ کے حوالے کرنا پڑتی، ڈیوڈ پولس کو ہفتہ بھی دیتا تھا اور ان کی ہر طرح سے نگہبانی بھی کرتا تھا۔

گھر ٹھیک چل رہا تھا۔ باپ کی دوا آ رہی تھی، دو وقت کا کھانا مل رہا تھا۔
مگر وشواس کو کبھی کبھار اس کا ضمیر کچوکے لگاتا کہ وہ دوسروں کے پیٹ پر لات مار کر اپنا کام چلا رہا ہے۔ پر یہ کہہ کر وہ خود کو مطمئن کر لیتا کہ اگر وہ جیب کترنا چھوڑ دے تو کیسے گزارا ہوگا؟ اب شردّھا بھی بڑی ہو رہی تھی، اس نے چودھواں پار کر لیا تھا۔

مہینے کی شروعات تھی۔ وشواس نے اچھا ہاتھ مارا تھا۔ پرس خوبصورت تھا اور اوپر کے خانے میں رکھی لڑکی کی تصویر بھی خوبصورت تھی۔ پرس میں پورے تین ہزار روپئے تھے جس میں سے پندرہ سو روپئے استاد ڈیوڈ نے لیے، باقی رقم لے کر وشواس گھر کی طرف آ رہا تھا۔ پرس کے اوپر کے خانے میں رکھی لڑکی کی خوبصورت تصویر مسکرا رہی تھی۔ نالے کے قریب گہرا اندھیرا تھا۔ وہ نالہ پار کر کے گھر آنے کی فکر میں تھا کہ کسی کی کرخت آواز نے اس کے قدم روک دیئے۔
ایک سایہ قریب آیا اور اگلے ہی لمحے اس کا ہاتھ وشواس کے گریبان پر تھا، دوسرے ہاتھ میں چاقو تھا جس کی نوک وشواس نے اپنے سینے پر محسوس کی۔ وہ بھلے ہی جیب کترا اُچکا تھا مگر لڑائی دنگے سے دور رہتا تھا۔

وشواس کا سانس گھٹنے لگا۔ آواز آئی:

''خبردار! اگر آواز نکالی، لاش کا بھی پتہ نہ چلے گا۔''

آواز والے سائے نے وشواس کی جیب سے خوبصورت پرس اڑا لیا اور اسے دھکا دے کر نالے میں گرا دیا۔

خوف زدہ وشواس پسینے سے لت پت، نالے میں جانے کب تک پڑا رہا۔ نالے میں کیچڑ تھا، جب اوسان بحال ہوئے تو وہ اوپر آیا، اب وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ اندھیرا اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ وشواس کا دل اب بھی دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد جھونپڑے پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا جھونپڑے پر لوٹنے کا راستہ بدلنا پڑے گا۔

وشواس جھونپڑے میں داخل ہوا تو اسے جیسے چکر سا آ گیا جب اس نے دیکھا کہ بہن شردھا ماں کو وہی پرس دے رہی تھی جس پر خوبصورت لڑکی کی تصویر تھی!!

☆☆☆

جوتے:

''ڈیڈی! آپ کہہ رہے ہیں کہ ڈکشنری مہنگی ہے، کیا آپ کے جوتے سے بھی؟''

یک سطری کہانی - ع.ع.خ

تم سے دور

اسے کیا کہوں، بدقسمتی یا خوش قسمتی؟ جو بھی ہو، آج پھر میں پیر کی چوٹ کے سبب بستر پر ہوں۔ کوشش کے باوجود نیند مجھ سے کوسوں دور ہے۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔ چاروں طرف ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ اُس پار کالے آسمان پر کوئی ستارہ تک نہیں چمک رہا اور اونچے اونچے پیڑوں کے بیچ جگنو آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ کتنی پُر مسرت ہے ان کی زندگی! کتنے مست ہیں یہ اپنے کھیل میں۔ ان کی زندگی میں نہ کوئی سماج ہے اور نہ کوئی بندھن۔

صبح ڈاکیے نے مجھے ایک لفافہ دیا۔ لفافہ دیکھ کر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کس کا خط ہو سکتا ہے۔ انگریزی زبان میں میرا پتہ ٹائپ کیا ہوا تھا۔ ڈاک گھر کی مہر دیکھ کر مجھے کچھ یاد آیا....

سینٹ زیویرس کالج کے سوشل سروس کیمپ میں سڑک کا کام کرتے وقت پیر کو شدید چوٹ پہنچی تھی، ڈاکٹر نے چیک اپ کیا تھا۔ انجکشن لگانے کے بعد دوائیاں اور ایکس ریز کے بارے میں لکھ دیا تھا اور جاتے جاتے آرام کا مشورہ دیا تھا۔ بستر پر لیٹے لیٹے نہ جانے کتنے ہی سوال حل کر لئے تھے میں نے۔ مجھے سوئے کتنی دیر ہوئی ہوگی نہیں کہہ سکتا۔

یکایک کسی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ سامنے ہیما دوائی لیئے کھڑی تھی۔

"آپ!...."

''ہاں میں! کوئی اعتراض؟''

''نہیں، اعتراض کی کوئی بات نہیں، لیکن.....''

''لیکن کیا؟ سوشل سروس کر رہی ہوں میں۔''

میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ دوا پلانے کے بعد ہیما نے کہا:

''اب آپ چپ چاپ لیٹ جائیے!''

......کچھ سوچ کر میں لیٹ گیا تھا!

صبح جان نے سڑک تیار ہونے اور اس کے دونوں جانب پودے لگانے کا کام مکمل ہونے کی خبر سنائی اور کہا:

''......کیا خیال ہے؟ لڑکی اچھی ہے، زندگی سدھر جائے گی۔''

جان کے اس سوال نے مجھے پھر سوچنے پر مجبور کر دیا تھا، کیوں، اس وقت نہیں کہہ سکتا۔

کیمپ سے لوٹتے وقت ہیما میرے ساتھ تھی۔

ایک بچے نے جو ہیما سے کافی بے تکلف ہو چکا تھا، دوڑتے ہوئے اس کی انگلی پکڑ لی تھی اور اپنی توتلی بولی میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس بچے کی بھولی بھالی باتوں پر لوگ ہنس رہے تھے۔ اور پھر وہ ہیما سے ٹافی لے کر مسکراتا ہوا چلا گیا تھا۔

پلیٹ فارم پر ہیما نے مجھ سے بہت سی باتیں کی تھیں۔ چھوا چھوت، دھرم، مذہب، سماج، بندھن وغیرہ۔

کالج کھلنے تک ہم ایک دوسرے کے بہت ہی قریب آ چکے تھے۔ ہم یہ بھول گئے تھے کہ اونچ نیچ، ذات پات، رسم و رواج، دھرم و مذہب اور سماج و سنسار جیسی بھی کچھ چیزیں ہیں جو انسانی زندگی میں اہمیت رکھتی ہیں۔

روزانہ کی طرح اس دن پھر ہم دونوں جوہو کی ریت پر بیٹھے تھے۔ ہیما گھروندہ بنا رہی تھی۔ سمندر کی لہریں اٹھکھیلیاں کر رہی تھیں۔ کچھ لوگ گروپ کی شکل میں ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ جوڑے یہاں وہاں بیٹھے تھے اور پیار بھری سرگوشیوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ ہیما بھی گم صم کھوئی

کھوئی سی نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد میں نے خاموشی توڑتے ہوئے پوچھا:

''ہیما! بات کیا ہے؟ خاموش کیوں ہو؟''

''کچھ نہیں، یوں ہی۔''

''نہیں..... تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟ آخر کیا بات ہے؟''

''..... میں سوچ رہی ہوں، کیوں نہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنا لیں..... جب کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب آ چکے ہیں کہ اب دور جانا ممکن ہی نہیں ہے..... پڑھائی تو چلتی ہی رہے گی..... تمہارا کیا خیال ہے؟''

''..... اتنی جلدی کیا ہے؟..... اور شادی بیاہ کے معاملے میں ماتا پتا کی رائے بھی تو اہمیت رکھتی ہے۔''

''پتا جی مجھے فارین بھیجنا چاہتے ہیں۔ وہ تم سے ملنا بھی چاہتے ہیں۔ ایک بار تم ان سے مل تو لو..... اگر وہ ہماری شادی کو تسلیم نہ کریں تو پھر..... کورٹ.....!''

اور پھر دوسرے دن ہیما کے پتا سے میری ملاقات ہو گئی تھی۔ عمر میں وہ میرے ڈیڈی کے برابر تھے۔ چائے کے بعد انہوں نے میری خیریت پوچھی تھی اور باتوں کے بیچ ہیما اور میرے تعلق سے کچھ ایسی باتیں کہی تھیں، جو مجھے اُس وقت کڑوی لگی تھیں۔

''بیٹا، تم سمجھ دار ہو، تمہیں اپنی ذمہ داری سمجھنی چاہئے۔ جوانی میں انسان سے غلطی ہو سکتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آنے والی نسل اس غلطی کی شکار ہو جائے۔ دھرم اور مذہب انسان کی زندگی میں کہاں تک ضروری ہے! یہ ایک لمبی بحث ہو سکتی ہے، میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ انسان کی سمجھ بوجھ پر منحصر ہے لیکن ہم سماج میں رہتے ہوئے، اس کے اصولوں کو توڑ کر برادری سے منہ بھی تو نہیں موڑ سکتے۔''

کچھ دیر بعد وہ بولے:

''اگر ہیما کو بھول کر تم اپنی پڑھائی جاری رکھو گے، تو مجھے خوشی ہو گی!''

.... اسی دھرم اور مذہب کے سوال کو سلجھانے میں رات کیسے گزر گئی تھی نہیں کہہ سکتا۔

کچھ عرصے بعد ہیما سوٹ کیس لئے میرے دروازے پر کھڑی تھی۔

پریشان، بدحواس اور لاابالی انداز میں مسکراتے ہوئے، میرے پوچھنے پر خود کو مطمئن دکھاتے ہوئے اس نے کہا تھا:

''پتا جی چاہتے ہیں تمہیں چھوڑ کر میں فارین چلی جاؤں ...... لیکن میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی، میں نے گھر ہی چھوڑ دیا ہے۔ مجھے پتا جی کی پرواہ نہیں ہے، تم جو میرے ساتھ ہو! کہیں اور چل کر رہیں گے۔ مگر رہیں گے ساتھ ساتھ اور مریں گے بھی ساتھ ساتھ! اس بھید بھاؤ اور ظالم سماج میں ہمارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔''

ہیما کی اس حرکت پر مجھے حیرت تھی، میں نے اسے بٹھایا اور پوچھا:

''ہیما! کیا تم نے واقعی گھر چھوڑ دیا ہے؟''

''ہاں ...... کیا تمہیں وشواس نہیں ہو رہا ہے؟''

''نہیں ......''

''یہ رہی چابی، سوٹ کیس میں میں نے اپنی تمام ضروری چیزیں رکھ لی ہیں! دیکھ لو۔''

''لیکن ہیما! تم نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔''

میں اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن مجھے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ حالاں کہ میں اپنے دوستوں میں ڈکشنری کہلاتا تھا! آخر میں بولا:

''ہیما! ...... آگے بڑھنے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن جو انسان وقت کی آنکھوں سے دیکھتا ہے، وہ اپنا ہر قدم سنبھال کر اٹھاتا ہے۔ کل ہمارے تعلق سے بھی لوگ یہی کہیں گے کہ واسنا کے دو کیڑوں نے سماج سے بھاگ کر شادی کر لی۔ ہمارا یہ فرار ہماری کمزوری ہے۔ تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی ہم غلط قدم اٹھا لیتے ہیں۔ ہم زمانے کے آگے چلنے کی کوشش کرتے ہیں اور زمانہ ہمارے ساتھ نہیں چل پاتا۔ بہتر یہی ہوگا کہ ہم اکیلے آگے بڑھنے کی بجائے زمانے کو اپنے ساتھ لینے کی کوشش کریں۔ زندگی صرف عشق ہی نہیں ہے ...... ہیما! ہمارے بیچ سماج اور ذات پات کی جو دیوار ہے، اسے اس طرح میں نہیں توڑ سکتا ...... جو کہانی ناممکن ہے اسے ممکن کرنے کی ایک بے کار کوشش کرنا جہالت کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

شاید ہیما کو لگا تھا کہ میں نے اسے دھوکا دیا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے۔ چارپائی سے اٹھتے ہوئے کانپتی آواز میں اس نے کہا تھا:

''.......... اب میں .... تمہارے راستے کی رکاوٹ .... نہیں بنوں گی ...... میں .... فارین چلی جاؤں گی .... تمہاری .... نظروں سے ...... دور .... تم سے دور ....!''

چلتے چلتے پل بھر کے لئے دروازے پر رک کر اس نے مڑ کر آخری بار مجھے دیکھا تھا، اور پھر کانپتے ہونٹوں کو سکوڑتے ہوئے سسکیاں بھرتی گردن جھکائے وہ چلی گئی تھی۔ اسے روک کر میں کچھ نہیں سمجھا سکا تھا..........

.... یادوں سے اُبھرتے ہوئے میں نے لفافہ کھولا .... اندر سے ایک تصویر نکلی، جانی پہچانی شکل کی ایک عورت بچے کو گود میں لئے کھڑی تھی۔ ایک رقعہ بھی ساتھ تھا۔ ''میں تمہیں تو بھول گئی مگر اپنے بیٹے کو تمہارا نام دینا نہیں بھولی۔'' نیچے دستخط تھے۔ ''ہیما''۔

اس تصویر کو ہاتھوں میں تھامے میں سوچ رہا ہوں۔ کیا میرا فیصلہ صحیح تھا، کیا ہیما سے شادی نہ کر کے میں نے غلطی کی؟

☆☆☆

ہوم ورک :

''میڈم! میں بہت شرمندہ ہوں کل رات ہوم ورک نہ کر سکی، ڈیڈی نے کچھ زیادہ ہی پی لی تھی!''

یک سطری کہانی - ع.ع.خ

اب کیسے کہوں .... !!

راجن نے اپٹا کے کئی ڈراموں میں چھوٹے رول کیے تھے۔ چند دنوں وہ گجراتی تھیٹر سے بھی جڑا رہا۔ کچھ ڈرامے خود کئے اور کئی ڈراموں میں اہم رول ادا کئے۔ پرتھوی تھیٹر میں اس کے تجرباتی ڈرامے بھی اسٹیج ہو چکے تھے۔ تھیٹر کی دنیا میں گذشتہ ۲۰ر برس سے اس کا نام جانا پہچانا تھا۔ آج کل وہ سیریل کر رہا تھا۔ اس کے دو بچے تھے، لڑکا کرن پانچویں اور لڑکی کیرتی ساتویں جماعت میں پڑھ رہے تھے۔ بیوی روپا کی ایک طویل بیماری میں موت ہوگئی تھی۔ وہ مصروف انسان تھا اس لئے بچوں کو ماں کا پیار دینا اس کے بس میں نہ تھا، اسی لئے اس کے دوستوں اور احباب نے رائے دی کہ وہ دوسری شادی کرلے اور بچوں کے لئے ایک ماں گھر لے آئے۔

سواتی یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں لکچر رتھی، وہ راجن کی سرگرمیوں سے نہ صرف واقف تھی بلکہ اس کے ساتھ ڈراموں میں حصہ بھی لیا کرتی تھی۔ وہ اس کے فن کی دلدادہ تھی خود بھی ڈرامہ فیلڈ سے جڑی تھی اور کئی ڈرامے راجن کی ہدایت میں کئے بھی تھے۔

راجن کے ایک دوست وسیم نے ایک دن راجن سے پوچھا:

''سواتی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

راجن کے دل کی بات جیسے وسیم نے پوچھ لی تھی، لیکن راجن نے کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔

صرف اتنا ہی کہا:

''وسیم! سواتی خوبصورت ہے، باصلاحیت ہے، اچھی اداکارہ ہے اور وہ اچھی بیوی بھی ثابت ہوسکتی ہے، لیکن مجھے بچوں کے لئے ماں کی ضرورت ہے اور یہ ایک بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ سواتی شاید کسوٹی پر کھری کھری اترے''

وسیم نے کہا:

''آزما کر دیکھنے میں کیا حرج ہے؟''

راجن نے کہا:

''ٹھیک ہے دیکھوں گا۔''

NCPA کے تھیٹر میں راجن کا ایک اہم ڈرامہ ''لاجونتی'' ہونے والا تھا، اس ڈرامے میں دہلی کے آرٹسٹ بھی حصہ لے رہے تھے۔ سواتی ڈرامے میں راجن کی بیوی لاجونتی کا رول ادا کرنے والی تھی۔ ڈرامہ ریہرسل کے مراحل میں تھا۔

ریہرسل کے بعد راجن اور سواتی "Rangoli" میں بیٹھ گئے۔ اسنیکس اور کافی کی چسکیوں پر دنیا جہان کی باتیں کرنے لگے۔

سواتی نے راجن کے بچوں کا حال دریافت کیا:

''کرن اور کیرتی کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہیں۔'' راجن نے جواب دیا۔

''کیسی بدقسمتی ہے کہ بچوں کو ماں کی محبت سے محروم ہونا پڑا۔''

راجن نے کہا:

''سواتی! تم سے کوئی بات چھپی نہیں ہے۔ میں نے روپا کی بیماری میں پانی کی طرح روپیہ بہایا لیکن مالک کی مرضی کے آگے کس کا بس چلا ہے۔''

''میں جانتی ہوں راجن، لیکن کرن اور کیرتی ابھی بچے ہیں، انہیں ممتا کی ضرورت ہے۔ تم کس طرح یہ ذمہ داری نبھا سکتے ہو، تمہیں تھیٹر بھی دیکھنا ہے۔''

''میں سوچتا ہوں سواتی، کوئی اگر ان بچوں کو ماں کا پیار دے تو میں ایک بہت بڑی ذمہ داری سے چھٹکارا پا جاؤں، پھر تھیٹر میں پورا من لگاؤں۔''

''ایسی قربانی ہر عورت نہیں دے سکتی۔''

''میں یہ بھی سوچتا ہوں سواتی کہ اگر کوئی ایسی عورت نہیں ملی تو میں دونوں بچوں کو بورڈنگ میں ڈال دونگا۔''

''ایسا ہرگز نہ کرنا۔ بچوں کا مستقبل خراب ہوتا ہے۔ انہیں گھریلو سنسکار نہیں ملتے۔''

راجن نے کافی کا بل دیا اور دونوں ریستوراں سے باہر آ گئے۔

''تم تلاش کرو، کرن اور کیرتی کے لئے ماں!'' راجن اتنا کہہ کر ہنس پڑا۔

سواتی بھی مسکرادی۔

تیسرے دن فائنل ریہرسل تھی۔ سواتی نے بے حد عمدہ اداکاری کی۔ راجن نے تعریف کرتے ہوئے کہا:

''سواتی تمہاری باڈی لینگویج اور ٹائمنگ کافی پرفیکٹ ہے۔ میں بہت خوش ہوں، تم نے بیوی کے کردار میں جان ڈال دی ہے۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ڈرامہ ہی نہیں میری حقیقی زندگی میں بھی تم آ جاؤ۔''

سواتی اسے دیکھتی رہ گئی۔

''میں بڑا تنہا محسوس کرتا ہوں۔ تم میری اس تنہائی کو دور کرسکتی ہو۔''

ڈرامہ کامیاب رہا۔ شونقادوں کو بھی پسند آیا اور ناظرین نے بھی تعریف کی۔ سواتی اور راجن کو کئی سیریلوں کے آفر ملے۔ سواتی کو تو ایک فلم میں سپورٹنگ ایکٹریس کے رول کی آفر بھی ہوئی۔ اس نے راجن کو موبائیل کال کے ذریعہ آفر کے بارے میں بتایا بھی۔

''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے راجن! تمہارا شکر یہ کن لفظوں میں ادا کیا جائے۔''

راجن نے اسے مبارکباد دی اور موبائیل سوئچ آف کردیا۔

وسیم بھی وہیں بیٹھا تھا۔ اس نے پوچھا:

''راجن! تم نے بات چلائی یا نہیں؟''

''چلائی ہے یار!'' راجن نے لاپرواہی سے کہا۔

''چلائی ہے یار! ارے! کب فائنل ہوگی، جلد فیصلہ کرواور اسے بھی جلد فیصلے کے لئے کہو۔ آر یا پار۔''وسیم نے مخصوص انداز میں کہا۔

راجن چپ رہا۔

ایک دن:

''فلموں اور سیریلوں کے آفرز میں تم ہمارا آفر بھول گئیں۔'' راجن نے سواتی سے مسکراکر پوچھا۔

سواتی نے کہا:

''نہیں! مجھے یاد ہے تمہارا آفر، لیکن مجھے فیصلہ کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔''

راجن نے کہا:

''جلد کوئی فیصلہ کرو۔ لیکن ایک شرط بھی ہے سواتی، ویسے مجھے شرط لگانا ٹھیک نہیں لگتا، لیکن بچوں کے مستقبل کے لئے یہ ضروری ہے۔''

''کیسی شرط؟''

''تم ماں نہیں بنوں گی۔ صرف میرے بچوں کو ممتا دوگی۔''

سواتی بڑی دیر تک خاموش رہی۔ راجن نے موبائیل سوئچ آف کردیا۔

راجن کے والد پولس انسپکٹر تھے۔ ان کی بیوی یعنی راجن کی والدہ انہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ راجن کا بچپن ماں کی ممتا کے بغیر گزرا، اسے ماں کا پیار نہیں ملا اور تعلیم بھی کسی ایک مقام پر نہیں ہوئی کیونکہ اس کے والد کے ٹرانسفر ہوتے رہتے تھے۔ آخر میں انہوں نے راجن کو بورڈنگ میں داخل کردیا۔ پولس محکمہ میں ہونے کے سبب راجن کے والد کافی سخت مزاج تھے، راجن جانتا تھا کہ والدہ کے بغیر بچوں کی زندگی کیا ہوتی ہے۔ والدہ کی محرومی سے وہ واقف تھا، بچوں کے لئے ممتا سے بڑھ کر کوئی پیار نہیں ہوتا۔ اپنی محرومیوں کے بعد وہ اپنے بچوں کو کسی بھی قسم کی محرومی کا احساس ہونے نہیں دینا چاہتا تھا۔

راجن پس و پیش میں تھا کہ سواتی کیا جواب دیتی ہے، کیا وہ اس کی شرط مان لے گی؟ اس

نے کہا تھا کہ جو عورت قربانی دے سکتی ہے، وہی بچوں کو سچا پیار دے سکتی ہے، تو کیا سواتی کے اندر قربانی کا جذبہ ہے؟

دو چار دنوں بعد سواتی کا کال آیا۔ اسے راجن کی شرط منظور تھی۔

بڑی دیر تک راجن پر بے یقینی کی کیفیت طاری رہی۔ وہ پھر سے تصدیق چاہتا تھا۔

جب سواتی راجن کے گھر آئی، تو کرن اور کیرتی بھی اسکول سے آ گئے تھے۔ سواتی نے ان کا منہ ہاتھ دھلایا، کپڑے پہنائے، کھانا کھلایا، پھر لائے ہوئے تحفے دیئے۔ پیار بھری باتیں کیں۔ ادھر اُدھر پکنک پر جانے کے وعدے کیئے۔

کم مدت میں بچے سواتی سے جڑ گئے اور وہ بار بار کال کر کے سواتی کو بلانے لگے۔

آخر ایک دن آٹھ دس دوستوں اور تعلقات والوں کی موجودگی میں راجن اور سواتی نے کورٹ میرج کر لیا۔ راجن نے اپنے رشتہ داروں میں سے کسی کو مدعو نہیں کیا۔ راجن کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بھائی اپنی فیملی کے ساتھ کینیڈا میں مقیم تھا۔

راجن اور سواتی کی جوڑی مثالی تھی۔ بچے بھی نئی ممی سے خوش تھے۔ وہ سواتی کو ہمیشہ آنٹی ہی کہتے رہے۔ سواتی چاہتی تھی کہ بچے اسے ماں کہہ کر پکاریں، مگر بچے اسے ماں نہیں کہہ سکے۔ یہ قلق سواتی کو جھنجھوڑتا رہا۔ دونوں ویک اینڈ پر کار میں بچوں کو لے کر آؤٹنگ پر نکل جاتے۔ سنیچر اور اتوار خوب مزے کرتے، بچوں کے ساتھ کھیلتے، ایک دوسرے سے پیار کرتے۔ ممبئی کے مضافات والے پکنک اسپاٹ تو انہوں نے کب کے دیکھ لیئے تھے اور اب جلد ہی دونوں بچوں کے ساتھ سوئٹزرلینڈ ٹرپ پر جانے والے تھے۔ گھر کیا تھا، جنت کا نمونہ تھا۔ سواتی بڑے طریقے اور قرینے والی عورت تھی۔ اس نے بچوں کو خوب پیار دیا اور راجن کے ساتھ استری دھرم بھی اس طرح نبھایا کہ وہ نہال ہو گیا۔ راجن نے سواتی کی ڈرامہ صلاحیتوں کو بھی پھلنے پھولنے کا پورا موقعہ دیا۔

کبھی کبھار سواتی کے اندر کشمکش پیدا ہوتی، اسے لگتا جیسے اس کے بچے کوکھ سے اسے آوازیں دے رہے ہوں۔ ممی...... ممی!

وہ سوچتی...... کاش! کرن اور کیرتی اسے ممی کہتے۔

ایک ویک اینڈ:

وہ احمد آباد ایکسپریس ہائی وے پر واٹر پارک سے لوٹ رہے تھے کہ ہائی وے پر ان کی کار کا ٹائر پھٹا اور کار نے دو تین بار پلٹی کھائی۔ یہ تو محض ایک اتفاق تھا یا قدرت کا کوئی کرشمہ کہ کار میں آگ نہیں لگی۔ آس پاس کے لوگوں نے انہیں اسپتال پہنچایا۔ اسپتال میں بچوں کو نہیں بچایا جاسکا۔ راجن کی ایک ٹانگ کاٹنی پڑی۔

راجن اسپتال کے بستر پر لیٹا سوچ رہا تھا کہ وہ سواتی سے کیوں کر کہے کہ سواتی! اب تم ہی کو میری نسل بڑھانا ہے۔

وہ بار بار جملہ ترتیب دیتا اور مایوس ہو جاتا............

☆☆☆

واہ واہ:

''مشاعروں میں اُس نے بہت واہ واہ لوٹی، جب وہ مرا تو پاس کوئی رونے والا نہ تھا!''

یک سطری کہانی - ع.ع.خ

کمرشیل سرکس

وِمنز ہوسٹل کے ایک کمرے میں
چادر کھینچ کر روینہ نے سوئی ہوئی ارونا کو جگا دیا۔
''اے ارونا! اُٹھ۔''
''کیا ہے، کیوں پریشان کر رہی ہے؟'' آنکھیں ملتے اور لیٹے ہی لیٹے ارونا نے پوچھا۔
روینہ نے ارونا کا ہاتھ پکڑ کر بیڈ پر بٹھا دیا۔ پھر کھینچتی ہوئی اُسے ایزل کے سامنے لے گئی اور کہا:
''دیکھ رات میں نے یہ تصویر پوری کردی۔''
''اوہ! تو نے اسے دکھانے کے لئے میری نیند خراب کی ہے۔ خودغرض کہیں کی۔''
''اس تصویر کو آنکھ کھول کر دیکھ۔''
''کیا دیکھوں؟ یہ ہاتھی ہے یا زیبرا۔''
''اری! یہ کسی جانور کی تصویر نہیں۔''
''ہاں! مگر ہے کیا، اس میں تو سڑک، آدمی، عورت، بس، موٹر کار، موٹر سائیکل، مکان اور فلائے اوور سب ایک دوسرے پر سوار ہوئے جا رہے ہیں۔ جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ کیوں بے وقوف بنا رہی ہے لوگوں کو!''

''ذرا سوچ تو کس چیز کی علامت ہے یہ۔''

''تیری بے وقوفی کی۔''

''ذرا دماغ لگانے کی کوشش کرے گی تو سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا۔''

''تو بے کار ایسی تصویریں بنا بنا کر اپنی زندگی کو absurd (ابزرڈ) اور بے معنی بنا رہی ہے۔''

ارونا مونہہ دھونے چلی گئی، لوٹی تو دیکھا تین چار بچے کمرے میں آ گئے ہیں۔

بچوں کو دیکھتے ہی ارونا نے کہا:

''نمستے! چلو میں آتی ہوں۔''

''کیوں یہ بندر پال رکھے ہیں تو نے؟'' روینہ نے پوچھا۔

''یہ مت بھول کہ ڈارون کے کہنے کے مطابق ہم سب بغیر دم کے بندر ہی ہیں۔''

''ڈارون کی تھیوری تجھے مبارک، تیری فلاسفی تجھ تک ہی رہنے دے۔ ایک دن تیری کلاس کی تصویر بنانا پڑے گی۔ لوگوں کو دکھائیں گے کہ دیکھو ہماری ایک دوست ارونا بھی ہے جو غریب بستی کے بچوں کو پڑھاتی ہے اور خود کو سماج سیویکا سمجھتی ہے۔''

''جا جا! تیری طرح اوٹ پٹانگ لکیریں کھینچ کر تو وقت برباد نہیں کرتی۔'' ارونا نے کہا اور پاؤں میں چپل پہن کر باہر میدان کی طرف نکل گئی جس میں کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا اسکول واقع تھا۔

باندرہ کے اس womens' hostel (ومنز ہوسٹل) میں رات دس بجے کے بعد ہوسٹل میں مقیم لڑکیوں کے آنے جانے پر پابندی عائد تھی، لیکن ارونا کو اس پابندی سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔

ارونا صبح سے مسلسل پریشان تھی۔ قریب کی غریبوں کی بستی میں پھول دیوی کا بچہ بیمار تھا۔ دوپہر سے وہ اُس کے یہاں بیٹھی تیمارداری کر رہی تھی۔ اور اب گیارہ بج رہے تھے۔ پتہ نہیں کیا ہوا تھا بے چارے بچے کو آنکھ ہی نہیں کھول رہا تھا۔ مقامی ڈاکٹر نے اسپتال میں داخل کر دینے کا مشورہ دے دیا تھا۔

ارونا کمرے میں آہستہ سے داخل ہوئی تاکہ روینہ کی نیند ڈسٹرب نہ ہو، لیکن روینہ جاگ رہی تھی۔ ہوسٹل کے mess سے ارونا کے لئے کھانے کی تھالی آ گئی تھی جو اخبار سے ڈھک کر ٹیبل پر رکھ دی گئی تھی۔

''بڑی دیر ہوگئی۔''

''وہ بچہ بہت سیریس ہے۔ جانے اسپتال والے اسے بچا پائیں یا نہیں؟''

اُس کی آواز دکھ اور افسوس میں ڈوبی ہوئی تھی۔

روینہ نے تھالی سے اخبار اٹھایا اور فلٹر سے پانی لانے کاری ڈور میں جانے لگی۔

''رہنے دے روینہ، میں نہیں کھا پاؤں گی۔'' اور اس کی آنکھیں چھل چھلا گئیں۔

پیار سے ارونا کی پیٹھ تھپ تھپاتے ہوئے روینہ نے کہا:

''بھگوان پر بھروسہ رکھو وہ ٹھیک ہو جائے گا، اب بھوکا رہنے سے کیا، تھوڑا کھالے۔''

''نہیں رہنے دے، مجھے بھوک نہیں ہے۔''

ایک open air ریستوراں میں پیازی رنگ کے سلیولیس بلاؤز اور بادامی رنگ کی ساڑی میں ملبوس روینہ چائے پر ارونا کا انتظار کر رہی تھی۔ بار بار وہ اپنی داہنی کلائی پر بندھی مردانہ گھڑی دیکھ رہی تھی۔ اُس کی انگلیوں میں جلتی ہوئی سگریٹ تھی جس کے وہ وقفے وقفے سے کش لگا رہی تھی۔

ارونا کمرے میں داخل ہوئی۔

''تیرے رونک کی چٹھی آئی ہے۔''

''تو نے کھول کر تو نہیں پڑھ لی۔''

''چل ہٹ، ایسی بور چھٹیاں پڑھنے کا فالتو وقت کس کے پاس ہے۔ چٹھی میں کیا رہتا ہے۔ آدرش وادرش جن پر کوئی عمل نہیں کرتا۔ ایسا کرلیں گے، ویسا کرلیں گے، جیسے خط نہیں لیکچر دے رہے ہوں۔''

وہ لفافہ اُچک کر ارونا نے روینہ کے ہاتھ سے لے لیا اور بیگ میں رکھ دیا۔

''آج ڈیڈی کی بھی چٹھی آئی ہے۔ انہوں ے کہا ہے جیسے ہی یہاں کا کورس ختم ہو جائے میں امریکہ جاسکتی ہوں۔''

''ہاں بھئی! دولت مند باپ کی اکلوتی بیٹی جو ٹھہری۔ سچ بتاؤں روینہ، مجھے تیری کلا فضول لگتی ہے۔ دنیا میں کوئی بڑا واقعہ ہو جائے، تیرے کسی کام کا نہیں، جب تک اس میں تیری تصویر کے لئے کوئی آئیڈیا نہ ہو۔''

''میری تو یہی تمنا ہے کہ امرتا شیر گل کی طرح میرا نام بھی چاروں طرف گونجے۔'' روینہ

نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

''کاغذ پر ان بے معنی تصویروں کی بجائے کسی کی زندگی بنادے۔ تیرے پاس استطاعت ہے صلاحیت ہے۔'' ارونا نے کہا۔

''وہ کام میں نے تیرے اور رونک کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ تم دونوں شادی کرلو، پھر جلد سے جلد دنیا کا کلیان کرنے کے لئے جھنڈا لے کر نکل پڑنا۔''

''تو کہے تو ہم تیرا بھی کلیان کردیں گے بنا شادی کئے۔''

''ہاں ہاں! چپ بیٹھ، تو نے اپنے اسکول میں دو چار بچے کیا پڑھا لیئے سمجھنے لگی کہ سارا سماج پڑھ لکھ گیا۔'' روبینہ نے کہا اور سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی۔

ایک سال بعد:

آج روبینہ نیویارک جارہی تھی۔ اس کے ممی ڈیڈی سیدھے سہار انٹرنیشنل ایئرپورٹ پہنچنے والے تھے۔ روبینہ کے اعزاز میں الوداعی جلسہ بھی شاندار ہوا تھا۔ ارونا صبح سے ہی اس کا سامان پیک کررہی تھی۔ روبینہ کی فلائٹ رات ۸ بجے تھی۔ ایک ایک کر کے وہ سب سے ملاقات کر آئی تھی۔ جب وہ ہوسٹل پہنچی تو تین بج رہے تھے۔

''اتنی لیٹ کیوں ہوگئی؟'' ارونا نے پوچھا۔

''یار! ہوسٹل سے کچھ دور تو نے بھی دیکھا ہوگا پیڑ کے نیچے ایک مانگنے والی معذور عورت بیٹھا کرتی تھی۔ ابھی دیکھا تو وہ مری پڑی ہے اور اس کا لڑکا اور لڑکی اس سے چمٹ کر رورہے ہیں اور تھوڑے فاصلے پر ہی کچھ لوگ ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھ رہے ہیں۔ میں اپنے آپ کو روک نہ سکی اور وہیں اپنی اسکیچ بک میں اس منظر کا ایک رف اسکیچ بنالیا۔ دھیرے دھیرے وہاں بھیڑ جمع ہوگئی اور میں نے اس عورت کے سرہانے پڑے پلاسٹک کے کٹورے میں سو کا نوٹ رکھا اور وہاں سے کھسک آئی۔''

امریکہ جاکر روبینہ آرٹ اور پینٹنگ کے گہرے مطالعے میں ڈوب گئی۔ اس کی لگن نے اس کی کلا کو نکھار دیا۔ اس کی تصویروں کی نمائش ہوئیں۔ بے جان معذور عورت سے چمٹ کر روتے

ہوئے بچوں کی تصویر کو، جسے اس نے 'کمرشیل سرکس' کا نام دیا تھا، اس کا شاہکار کہا گیا اور روینہ موقر انعامات سے نوازی گئی۔ تصویر کے عنوان پر آرٹ کے کئی حلقوں سے نکتہ چینی بھی کی گئی تھی۔ ایک مشہور و معروف آرٹ کریٹک نے روینہ کو مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ اس تصویر کا عنوان 'کمرشیل سرکس' کے بجائے 'میرا بھارت مہان' رکھ لے، مگر روینہ راضی نہ ہوئی تھی، اس نے یہ کہہ کر آرٹ کریٹک کو ٹال دیا تھا کہ وہ اس کے مشورے پر غور کرے گی۔

پانچ سال بعد:

ممبئی میں بھی روینہ کی تصویروں کی نمائش کا موقعہ آیا۔ اس نمائش میں کافی لوگوں نے شرکت کی۔

اُس روز روینہ ڈارک بلیوٹی۔شرٹ اور اسی رنگ کی جینز میں ملبوس تھی۔ ارونا حسب معمول سادہ ہندوستانی کپڑے پہنے نمائش میں آئی۔

جب دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو دوڑ کر لپٹ گئیں۔

''ارونا! تجھے کب سے تصویریں دیکھنے کا شوق ہو گیا۔'' روینہ نے پوچھا۔

''یار! اخباروں کے ذریعے پتہ چلا تیری تصویروں کی نمائش لگی ہوئی ہے اس لئے خاص طور پر تجھ سے ملنے چلی آئی۔ یار! ایک بات تو بتا تُو نے شادی کی؟'' ارونا نے پوچھا۔

روینہ نے سگریٹ جلا کر کش لیا اور بڑی سنجیدگی سے کہا:

''میں شادی وادی میں بالکل یقین نہیں کرتی۔ زندگی بھر مجھے شوہر کی pampering commodity بن کر نہیں رہنا ہے۔ جیسی میں ہوں خوش ہوں۔ مجھے آزادی پسند ہے اور سچ بتاؤں مطمئن زندگی گزارنے کے لئے مجھے شادی کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں۔''

روینہ نے لمبا کش لیا اور سگریٹ مسل کر ڈسٹ بن میں ڈال کر کہا:

''ویل، شادی کئے بغیر کسی کے ساتھ رہنے میں مجھے ذرا بھی اعتراض نہیں ہے۔ میر تجس آر برِیکنگ لائک اینی تھنگ۔ لوگ ایکسپریمینٹ کرنے کے لئے شادی کرتے ہیں اور جب ایک دوسرے کو قبول نہیں کر پاتے تو جلد ہی الگ بھی ہو جاتے ہیں۔ شادی کی جھنجھٹ ہی کیوں پالی جائے، لیو اِن ریلیشن شِپ کیا غلط ہے؟ اتنا ہی نہیں! فیوچر میں اگر میری لڑکی بھی شادی کئے بغیر کسی کے ساتھ لیو اِن ریلیشن شپ قبول کرے گی تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ لوگ کیا کہیں گے مجھے اس کی پرواہ

نہیں! ...... سمجھی!''

''خیر! روبینہ تو نہ سہی میں تو شادی میں یقین رکھتی ہوں۔''

وہ باتیں کر رہے تھے کہ دو پیارے بچے اروناکے پاس دوڑتے ہوئے آئے۔

''یہ بچے؟'' اروناکے قریب کھڑے بچوں کو دیکھ کر روبینہ نے پوچھا،'' کیا یہ تیرے ہیں؟''

''میرے ہی ہیں اور کس کے ہو سکتے ہیں۔ بچو یہ تمہاری روبینہ موسی ہے۔ نمستے کرو۔'' ارونا نے بچوں سے کہا۔ بچوں نے نمستے کیا۔

''کیسی موسی ہے بچوں کو پیار تو کر۔'' ارونا نے روبینہ سے کہا۔ روبینہ نے دونوں کے سر پر ہاتھ پھیر کر ماتھا چوما۔

''تمہاری یہ موسی بہت اچھی تصویریں بناتی ہیں۔ یہ ساری تصویریں ان ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔''

''سچ!'' حیرت سے لڑکی نے کہا۔

''پھر تو آپ ڈرائنگ میں ہمیشہ فرسٹ آتی ہوں گی۔'' لڑکے نے پوچھا۔

روبینہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔

تب لڑکی نے خوش ہو کر کہا:

''میں بھی فرسٹ آتی ہوں۔''

بچوں کو روبینہ نے تصویروں میں محو پا کر ارونا سے پوچھا:

''اب سچ سچ بتا، یہ بچے کس کے ہیں؟''

ارونا نے حسبِ معمول چہرے پر شگفتگی کو برقرار رکھتے ہوئے جواب دیا:

''اب تو ضد کرتی ہے تو سن! نیویارک جاتے ہوئے تو جس منظر کا اسکیچ اپنے ساتھ لے گئی تھی، میں اسی منظر سے یہ بچے اٹھالائی ہوں۔''

تصویریں دیکھتے دیکھتے رونک بھی اُن کے قریب آ گیا تھا۔ اس نے قریب آتے ہی ارونا سے پوچھا:

''بچے کہاں ہیں؟''

''وہ رہے۔''

اس نے انگلی کے اشارے سے ان کی جانب اشارہ کیا۔

کچھ دیر بعد:

جب وہ پانچوں آرٹ گیلری کے ریستوراں 'سماور' میں بیٹھے کھا پی رہے تھے تو روینہ نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں لمبا سا سلگتا ہوا سگریٹ لیئے ان بچوں کو مسلسل دیکھے جا رہی تھی۔

روینہ کو نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوا کہ اگر وہ برش اور رنگوں سے زندگی کو چھونے کے بجائے ارونا کی طرح انگلیوں کی پوروں سے چھونا سیکھ لیتی تو اس کی زندگی کے خلاء میں سگریٹ کا دھواں نہ ہوتا۔

☆☆☆

انعامات:

''اس نے تھیلی اُلٹ کر دوست کو انعامات دِکھلا دیئے!''

یک سطری کہانی - ع.ع.خ

میٹھی ندی کی کڑواہٹ

۲۶؍جولائی ۲۰۰۵ء بروز منگل:

آسمان جیسے پھٹ پڑا تھا، سہ پہر کو موسلا دھار بارش اچانک شروع ہوئی اور شام گہری ہوتے ہی ساری ممبئی جل تھل ہوگئی۔ کچھ علاقوں میں بجلی غائب تھی۔ صرف ٹرانسسٹر اور ایف۔ایم۔ پر نشریات جاری تھیں۔ جہاں تک رپورٹر کیمرہ مین اور ٹی وی چینل والے پہنچ سکتے تھے وہاں سے ممبئی شہر کے سیلابی حالات کا آنکھوں دیکھا حال دکھایا جا رہا تھا۔

کملیش کی آج چھٹی تھی۔ وہ ایک مشہور روزنامے میں رپورٹر تھا۔ شام کو دوستوں نے اندھیری میں ملنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن یہ قیامتِ صغریٰ ٹوٹ پڑی تھی۔ اب کیا کِیا جا سکتا تھا۔ کملیش کالینہ میں گزشتہ پانچ برسوں سے رہتا آیا تھا۔ اس کے گھر کے پچھواڑے ایک نالہ تھا، اس نے کبھی اس نالے کو اتنی اہمیت نہ دی تھی۔ لیکن اس روز شام ہونے تک یہ نالہ اہمیت اختیار کر گیا تھا اور کملیش نے پہلی بار سنا کہ یہ نالہ میٹھی ندی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ میٹھی ندی کے کنارے آباد لوگ بدحواس تھے۔ میٹھی ندی میں سیلاب آ گیا تھا اور یہ پانی کسی بھی وقت آبادی میں داخل ہو سکتا تھا۔

کملیش کی بیوی سومترا، ایک گھنٹہ پہلے اپنے قریبی رشتے دار کے گھر گئی ہوئی تھی اور وہاں سے حسبِ معمول بچی کو لینے اسکول جانے والی تھی۔ موسلا دھار بارش جاری تھی۔ کملیش نے کئی جگہ فون

لگایا لیکن فون کہیں نہیں لگا۔ وہ پریشان ہوگیا اور چھتری لے کر باہر نکلا۔ جیسے ہی وہ گلی سے نکل کر سڑک پر آیا تیز ہوا سے چھتری اُلٹ کر ٹوٹ گئی۔ کملیش بچی کے اسکول کی طرف دوڑا، اسکول میں کوئی نہیں تھا۔

کملیش بارش سے شرابور، پریشان حال ادھر اُدھر گھوم رہا تھا کہ اسے سومترا اور بچی دونوں نظر آئے جو بارش میں بھیگتے ہوئے تیز قدموں سے گھر کی طرف آرہے تھے۔ اس کی جان میں جان آئی اور وہ ان دونوں کو لے کر گراؤنڈ فلور کے اپنے فلیٹ میں آگیا۔ کملیش نے ایف.ایم. پر سنا کہ میٹھی ندی کے کنارے آباد علاقوں میں تیزی سے پانی بھرتا جارہا ہے۔

کملیش نے دیکھا کہ اس کے فلیٹ میں بھی پانی بھرنا شروع ہوگیا ہے۔ اس کے گھر میں بھلے ہی زیادہ قیمتی سامان نہیں تھا مگر جو کچھ بھی تھا وہ اسے بچانا چاہتا تھا۔ بہت سا سامان اس نے فلیٹ کے چھجوں پر چڑھا دیا۔ کچھ قیمتی سامان الماریوں کے اوپر رکھ دیئے۔ الماریوں میں جو قیمتی چیزیں اور امانتیں تھیں وہ سب سے اوپر کی دراز میں رکھ دیں۔ پھر اس نے مین سوئچ آف کرنے کے بعد فلیٹ کا دروازہ لاک کر دیا اور ابھی وہ لوگ پہلے منزلے کی سیڑھیوں پر ہی تھے کہ چوتھے منزلے پر رہنے والے فرنانڈیس نے انہیں آواز دی:

''مسٹر کملیش! اوپر آجایئے!''

کملیش سومترا اور بچی کو لے کر فرنانڈیس کے فلیٹ میں چلا گیا۔ وہاں گراؤنڈ فلور پر رہنے والے اور بھی لوگ تھے جنہیں فرنانڈیس نے پناہ دے رکھی تھی۔

فرنانڈیس نے سب کے لئے کھانے کا انتظام کیا۔ وہاں جمع مسلم اور غیر مسلم خواتین نے سب کے لئے کھانا تیار کیا، کیونکہ فرنانڈیس کی بیوی اور بچے گوا میں کسی شادی کی تقریب میں گئے ہوئے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ لوگ ٹرانسسٹر پر ممبئی اور مہاراشٹر کے دیگر علاقوں میں بارش کی تباہی کی خبریں سننے لگے۔

...... ''میں تو سمجھی تھی سونامی آگئی۔'' مہاراشٹرین خاتون نے کہا۔

...... ''یہ برسات کیا کسی سونامی سے کم ہے!'' مسلم خاتون بولی۔

...... ''جن لوگوں کے بھائی بہن اور دیگر افراد اس بارش میں پھنس گئے ہوں گے ان کا کیا حال ہوگا؟'' سومترا نے کہا، ''وہ تو اچھا ہوا میں بچی کو لے کر اسکول سے جلد آگئی۔''

......''فرمانڈیس صاحب کا بہت بہت شکریہ جوانہوں نے ہمیں یہاں پناہ دی۔ جلدی میں ہم یہ کر سکے کہ قیمتی زیورات، ضروری کاغذات اور ہمارے دوست رحمٰن کی امانت ۵۰ ر ہزار روپے الماری کی دراز میں سب سے اوپر رکھ دیئے۔ فلیٹ میں گھٹنے تک پانی بھر گیا تھا کیا کرتے جان بچاتے یا سامان۔''، کملیش نے کہا۔

......''میں نے تو اپنا پڑوسی دھرم نبھایا ہے، جان سلامت رہی تو سنسار پھر بس جائے گا۔'' فرنانڈیس نے کہا۔

ٹرانسسٹر پر نشریات جاری تھیں

......ہائی وے پر ٹریفک جام، لوگ کاروں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہزاروں لوگ کمر تک پانی میں بھیگتے چلے جا رہے ہیں۔ کوئی کسی کا پُرسان حال نہیں۔ بسیں پانی میں ڈوب گئی ہیں۔ ڈبل ڈیکر بس کی چھت پر لوگ طوفانی بارش میں بھیگ رہے ہیں۔ جے جے فلائی اوور پر کبھی لوگ نظر نہیں آتے لیکن آج وہاں بھی ایک جم غفیر ہے۔ دادر اور دوسرے فلائی اووروں کا بھی یہی حال ہے۔ ٹرینوں کے ٹریک پانی میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ٹرینیں بند ہیں......

سومترا کو اطمینان تھا کہ اس کا شوہر کملیش اور بچی اس کے ساتھ ہیں۔ اس نے سوچا کہ اگر مر بھی گئے تو تینوں ایک ساتھ مریں گے۔ ہاں مسلم خاتون اپنے شوہر کے بارے میں فکرمند تھی نہ جانے وہ کس حال میں ہوں گے۔ اسے اپنے رشتے دار کے گھر محمد علی روڈ فون کرنا تھا۔ شاید شوہر وہاں ہو!

کملیش نے موبائیل سے دوستوں، رشتے داروں اور اخبار کے دفتر میں کال کئے۔ لیکن نیٹ ورک کام نہیں کر رہا تھا۔

آل انڈیا ریڈیو سے خبریں نشر ہو رہی تھیں

.........دکانوں اور گوداموں میں پانی بھر گیا ہے جس سے کروڑوں روپیوں کا اناج خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ ایئر پورٹ اور ریلوے اسٹیشنوں پر ہزاروں لوگ پھنسے ہوئے ہیں۔ ساکی ناکے کے قریب چٹان کھسکنے سے کم از کم ۱۰۰ ر افراد مر جانے کا خطرہ ہے۔ وزیر اعلیٰ ہنگامی میٹنگ میں مصروف ہیں۔ اس طرح کی ریکارڈ بریک بارش گذشتہ ۱۰۰ ر برسوں بعد ہوئی ہے......

بچوں کو سلا دیا گیا تھا اور اب چائے کا دور چل رہا تھا۔ مسلم خاتون زیر لب دعائیں کر رہی تھی اور توبہ استغفار کر رہی تھی،

''یا اللہ! ایسی مصیبت کسی دشمن پر بھی نہ آئے۔''

''یہ سب ہمارے کرموں کا پھل ہے۔'' مہاراشٹرین خاتون نے کہا۔

ٹرانسسٹر پر نشریات جاری تھیں

.........بارش جاری ہے...... پانی پر جانوروں کی لاشیں تیر رہی ہیں۔ پھنسے ہوئے لوگ مدد کو چلا رہے ہیں۔ ہر طرف رونا دھونا مچا ہوا ہے جس سے سننے والوں کے دلوں میں ہول اٹھ رہا ہے......

نہ جانے کتنے لوگ کھلی گٹروں میں گرے ہوں گے! کملیش نے سوچا۔ اب اس کے بعد ملیریا، ٹائیفائڈ، لیپٹو اِسپائرَوسِس، گیسٹرو اور ڈینگو جیسے وبائی امراض بھی پھیلیں گے!

......ممبئی کرلا اور باندرہ کے مسلمان، ہندوؤں کی مدد کر رہے تھے، ہندو بھی مسلمانوں کی مدد کر رہے تھے۔ اس طوفانی بارش نے سب کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔ عبادت گاہیں پناہ گزینوں کے لئے کھول دی گئی تھیں۔ دور دور تک کوئی پولس مین یا میونسپل عملہ نظر نہیں آ رہا تھا جیسے کہ سارا شہر باہمی امداد پر چل رہا ہو!......

کملیش نے کہا:

''ٹی وی کی جگہ آج ٹرانسسٹر وردان بن گیا ہے۔ گھر بیٹھے سارے شہر کے حالات سے باخبر ہو رہے ہیں۔ کہاں ہیں وہ عوامی نمائندے جو الیکشن میں ہاتھ جوڑ کر عوام کو اپنا بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے، کہاں ہیں قوم کی ٹھیکیداری کا دم بھرنے والے؟''

فرنانڈیس نے کرائسٹ کی تصویر کے آگے ہاتھ جوڑ کر دعا مانگی۔ کمرے میں کچھ اور موم بتیاں بھی جلا دیں۔

فرنانڈیس نے بتایا:

''میٹھی ندی، وہار لیک اور پوائی جھیل کے پیچھے واقع پہاڑوں سے نکلتی ہے۔ یہ ندی بوریولی، پوائی، سانتا کروز، ایئرپورٹ، بیل بازار، ساکی ناکہ، سی ایس ٹی روڈ، واکولہ، باندرہ کرلا کامپلیکس، دھاراوی اور ماہم سے گزر کر کھاڑی میں گرتی ہے اور پھر خلیج کا پانی سمندر میں شامل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے جوار بھاٹا کے وقت سمندر کا پانی خلیج میں آ جاتا ہے اور پھر آس پاس کے علاقوں میں پھیل جاتا

ہے۔سی ایس ٹی روڈ، دھاراوی اور کرلا کامپلیکس میں لوگوں نے ندی کی چوڑائی کو غیر قانونی تعمیرات کے ذریعہ چھوٹا کر دیا ہے جس سے گھروں میں پانی بھر جاتا ہے اور پھر بڑے کامپلیکس تعمیر ہونے کی وجہ سے پانی نکلنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ زمین پر سیمینٹ کانکریٹ بچھا دینے سے پانی جذب بھی نہیں ہو پاتا۔

......میٹھی ندی نے عوام کی زندگی میں کڑواہٹ گھول دی ہے!

ٹرانسسٹر اب بھی شروع تھا۔لوگوں میں سونامی لہر کا خوف پہلے ہی سے موجود تھا، اس پر افواہیں آگ میں تیل کا کام کر رہی تھیں۔سونامی لہر ۲۶ر دسمبر ۲۰۰۴ء کو آئی تھی۔سماچار میں بتایا گیا تھا کہ کئی ٹیکسی اور رکشا ڈرائیوروں نے پھنسے ہوئے پریشان حال لوگوں کا استحصال کیا۔چوری چکاری بھی ہوئی۔ایک طرف عروس البلاد ممبئی کا انسان نواز چہرہ پیش کیا جارہا تھا تو دوسری طرف انتہائی مکروہ چہرہ بھی دکھایا جارہا تھا۔کوئی کار کا دروازہ ریموٹ سے بار بار کھول کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔کوئی بے دم ہو کر کار ہی میں پڑا رہ گیا تھا۔لوگ سینے تک پانی میں دھل رہے تھے اور وزیر اعلیٰ لوگوں کی دھیرج بندھا رہے تھے۔

ممبئی شہر کو سرکار شنگھائی بنانے کا خواب دیکھ اور دکھا رہی ہے لیکن ایک ہی دن کی بارش نے سارے انفرااسٹرکچر کی پول کھول دی ہے۔کیا محکمۂ موسمیات کو اتنی شدید بارش کی اطلاع نہیں تھی۔ ہمارا ڈزاسٹر مینجمنٹ آخر کیا کرتا ہے؟ کملیش نے جھنجھلاہٹ میں سوچا۔

علی الصبح ۵ ربجے فرنانڈیس کے فون کی گھنٹی بجی۔ مسلم خاتون کے شوہر کا فون تھا۔ پہلے تو فرنانڈیس نے حالات سے متعلق پوچھا۔ مسلم خاتون کے شوہر نے فرنانڈیس کا شکریہ ادا کیا۔فون کی گھنٹی سے ہڑبڑا کر مسلم خاتون جاگ اٹھی۔اس کی طرف دیکھتے ہوئے فرنانڈیس نے فون میں کہا:

''اپنی وائف سے بات کیجئے۔''

مسلم خاتون نے رُندھی ہوئی آواز سے ہلو کہا۔تب اس کا شوہر بولا:

''میں یہاں خیریت سے ہوں۔میں کسی کام سے محمد علی روڈ پر آیا تھا کہ بارش شروع ہوگئی۔ ٹی وی پر کالینہ کے حالات دیکھ کر میں نے محمد علی روڈ پر اپنے دوست کے گھر میں پناہ لینا مناسب

سمجھا۔"

بیوی نے کہا:

"ہماری آپ فکر نہ کریں۔ آپ موقعہ دیکھ کر وہاں سے نکلئے گا۔"

مسلم خاتون کے شوہر کی دکان لوہار چال میں تھی۔ شوہر کا فون آتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے نمازِ شکرانہ ادا کی۔

مہاراشٹرین خاتون کا شوہر بزنس ٹور پر ہانگ کانگ گیا ہوا تھا۔

اک ذرا اجالا ہوا تو کملیش فوراً اٹھا۔

رات بھر وہ بستر پر کروٹ بدلتا رہا تھا۔ رحمٰن کے ۵۰ رہزار روپیوں کی فکر اسے کھائی جارہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں پرارتھنا کررہا تھا کہ گھر میں رحمٰن کے پیسے الماری کی دراز میں محفوظ ہوں۔

وہ سیڑھیاں اترنے لگا۔ لیکن نچلے منزلے تک ہی اترا تھا کہ اس نے دیکھا...... سارا گراؤنڈ فلور پانی میں ڈوب گیا ہے۔

فلیٹ کے اندر کا حال کیا تھا اسے اندازہ نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں رہ رہ کر یہ سوال اُبھر رہا تھا، اندر فلیٹ میں کتنی اونچائی تک پانی بھرا ہوا ہے۔ پھر اس نے سوچا کہ جب ورشا دیوتا نے ان پر پرلئے ڈھایا ہے تو ناگ دیوتا کیوں ان کی اور ان کے اشیاء کی حفاظت نہیں کریں گے۔ یہ سوچتے ہی اس کے ہاتھ پرارتھنا کے لئے اٹھ گئے۔

☆☆☆

اِسٹیبلیشمینٹ :

"لوگ اسٹیبلیشمینٹ کے خلاف بولتے ہیں لیکن اُن کے دیئے ایوارڈز دونوں ہاتھوں سے جُھک کر قبول کرتے ہیں!"

یک سطری کہانی - ع.ع.خ

بارش میں پھنسی ہوئی بس

ا/ جون ۲۰۰۶ء : آج بھی بارش ہو رہی تھی۔

"میں جب بھی وہ رات یاد کرتی ہوں میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

ویشالی نے شیلی سے کہا۔

دونوں لوکل ٹرین میں سوار گذشتہ سال کی ۲۶/ جولائی کی تیز اور طوفانی بارش کو یاد کر رہے تھے۔ ٹرین ماٹنگا اور ماہم کے بیچ پٹریوں کے پانی میں ڈوب جانے کے سبب رک گئی تھی۔

شیلی نے ویشالی سے کہا:

"سچ مچ وہ رات بھیانک تھی۔ وہ قیامت خیز رات میں نے آفس میں گزاری تھی۔ چار عورتیں وہاں رکی تھیں، نہ کھانے کو کچھ تھا نہ سونے کا ٹھکانہ تھا۔ کسی طرح رات کٹ گئی اور ہم گھر جانے کے لئے نکلے، ٹرین سے اس دن باندرہ پہنچنے میں دو گھنٹے لگائے تھے۔"

ویشالی بولی:

"تم کو تو ایک محفوظ جگہ مل گئی تھی لیکن میں اس شدید قہر زدہ بارش میں لال باغ میں ایک بس میں پھنس گئی تھی۔ اس وقت میں کالاچوکی علاقے میں ایک ایکسپورٹ امپورٹ کے دفتر میں کام کر رہی تھی اور وہیں سے بس میں سوار ہوئی تھی، لیکن پانی کے زبردست ریلوں نے بس کو چلنے نہ دیا اور ہم خوف سے یہ سوچ کر کانپتے رہے کہ اگر بس بہہ جائے تو کیا ہوگا۔ آج بھی وہ کرب زدہ،

بھیانک بارش کی رات مجھے رہ رہ کر یاد آتی ہے اور میں کانپ جاتی ہوں۔''

''تم کہاں رہتی ہو؟'' شیلی نے پوچھا۔

''مرول ناکے پر'' ویشالی نے بتایا، ''اس رات ڈیڈی گھر پر نہیں تھے۔''

''تمہارے ڈیڈی کیا کرتے ہیں؟'' شیلی نے سوال کیا۔

''وہ ممبئی کارپوریشن میں سینٹری انسپکٹر تھے اور اس رات ایمرجنسی ڈیوٹی پر تھے۔ گھر میں ممی اکیلی تھیں۔''

ٹرین اب بھی رکی ہوئی تھی۔ لیڈیز کمپارٹمنٹ میں صرف دس پندرہ عورتیں ہی تھیں جن کی آنکھوں میں خوف بھرا ہوا تھا۔ شیلی اور ویشالی نے اپنے گھروں پر موبائیل سے اپنے پھنسے ہونے کی اطلاع دے دی تھی۔

ویشالی نے کہا:

''گذشتہ سال جب بادلوں کے پھٹنے سے قیامت خیز طوفانی بارش ہوئی تھی اور ایک ہی دن میں ۹۴۴ ملی میٹر بارش سے سارا شہر جل تھل ہو گیا تھا اور بارش نے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے تھے، لگتا تھا جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ لوگوں کو اس کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی بڑی مصیبت میں گھر جائیں گے، بہت سے لوگ کار میں شیشے بند کر کے بیٹھے تھے، مگر جب کار کے دروازے ریموٹ کنٹرول سے نہیں کھل سکے تو کار ہی میں دم گھٹ کر مر گئے۔ جو لوگ بسوں میں سوار تھے وہ بھی پھنس گئے۔ کیونکہ بس سے نیچے اتر نہیں سکتے تھے، گٹریں اور مین ہول میں کتنے لوگ گرے ہوں گے یہ تو اوپر والا ہی جانتا ہے۔ جھونپڑپٹیوں کا برا حال تھا۔ حتی کہ اکثر بلڈنگوں کے گراؤنڈ اور فرسٹ فلور بھی پانی میں ڈوب چکے تھے۔ بس ڈبل ڈیکر تھی، بس میں بیٹھے لوگ اوپر والے کو یاد کر رہے تھے اور اس گھڑی کو کوس رہے تھے جب وہ گھر سے نکلے تھے۔ بس کا نچلا منزلہ پانی میں ڈوب چکا تھا اور نچلے منزلے کے لوگ اوپری منزلے پر آ چکے تھے۔ ڈرائیور اور دونوں کنڈکٹر بھی اوپر ہی تھے۔

بادل گرج رہے تھے۔ بجلی کڑک رہی تھی اور بارش مسلسل جاری تھی۔ لوگ بھیڑ کی شکل میں اور قطاروں میں رسیوں کے سہارے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کندھے تک پانی میں ڈوبے چل رہے تھے۔ ٹرک، ٹیمپو، ٹیکسیاں اور پرائیویٹ کاریں راستوں میں انجنوں میں پانی بھر جانے کے سبب بند ہو گئی تھیں۔ فلائی اوور پر بھی لوگوں اور کاروں کا ہجوم تھا۔ قیامت کا سماں تھا۔ پانی میں

طرح طرح کی چیزیں بہی جا رہی تھیں۔ کبھی کوئی بچوں کا کھلونا نظر آ جاتا۔ کبھی چھوٹا سا پالنا، گیند، کبھی کسی بوڑھے کی لاٹھی نظر آ جاتی۔ کبھی دور کوئی جانور، بلی اور بھینس مری ہوئی حالت میں بہتے نظر آتے تو اُبکائی آ جاتی۔ کبھی کچرے کے کنستر بہتے نظر آتے تو کبھی ٹائر۔''

''کارپوریشن کا ڈزاسٹر مینجمینٹ کیا کر رہا تھا؟''

''سچ مچ اتنی قیامت خیز بارش کا انہیں اندازہ نہ تھا۔ بس میں پھنسے ہوئے لوگوں کا کہنا تھا کہ شہر اپنے پاپوں کی سزا بھگت رہا ہے۔ کچھ لوگ انتظامیہ کو گالیاں دے رہے تھے۔ عورتیں عوامی نمائندوں کو کوس رہی تھیں کہ جن کو انہوں نے ووٹ دیئے تھے۔ بارش اتنی تیز تھی کہ نہ عوامی خدمتگار نظر آ رہے تھے نہ پولس والے۔ ڈرینیج سسٹم فیل ہو چکا تھا جہاں پانی بہنے کے لئے نشیب تھا وہاں پہلے ہی بلڈنگیں تعمیر کر دی گئی تھیں، جب پانی کو نکلنے کا راستہ نہ رہا تو وہ گھروں اور دکانوں میں گھسنے لگا......''

ویشالی خاموش ہوگئی۔

ٹرین آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔

''ممبئی کو ایک عالمی سروے میں بڑا نامہربان شہر کہا گیا ہے۔'' ویشالی نے کہا۔

''ایسا نہیں ہے'' شیلی نے کہا ''کہیں کہیں بے حسی ضرور ہے، لیکن لوگ مصیبت میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔''

ویشالی نے جواب دیا:

''میں اپنا تجربہ بتاتی ہوں۔ میں جس بس میں پھنسی تھی اس کے آگے ایک اور بس تھی، اس بس میں میں نے دیکھا میرے پڑوس میں رہنے والا ایک شخص سوار تھا۔ میں اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اواز دے رہی تھی۔ ہاتھ ہلا ہلا کر اسے اشارہ کر رہی تھی لیکن وہ شخص بڑا بے حس نکلا۔ اس نے میری طرف توجہ نہ دی۔''

شیلی نے کہا:

''بارش کے شور میں اسے تمہاری آواز نہ سنائی دی ہوگی ایسا ہو سکتا ہے۔'' ویشالی نے خفگی کے ساتھ کہا:

''نہیں یہ بات نہیں تھی۔ میں اسے بے حسی کہوں گی کیونکہ اس نے میری طرف دیکھا تھا لیکن کسی ردعمل کا اظہار تک نہیں کیا، میں نے گھر پہنچنے کے بعد ممی سے پوچھا کہ کیا اس شخص نے

انہیں میرے بارے میں بتایا تھا تو ممی نے 'نا' میں جواب دیا تھا۔''

ویشالی کی بات پر شیلی چپ ہوگی۔

ٹرین چلتے چلتے پھر رک گئی۔

''یہ اسی طرح چلے گی۔'' شیلی بڑبڑائی۔

کچھ دیر بعد شیلی نے پوچھا:

''اچھا! پھر تم کیسے گھر پہنچیں؟''

ویشالی نے بتایا:

''رات میں نیول ڈاک سے نیوی کے جوان ربر بوٹ لے کر آ گئے اور ہمیں مصیبت سے نجات دلائی۔ ہمیں ربر بوٹ میں سوا کیا۔ وہ اپنے ساتھ کھانے کا سامان بھی لائے تھے۔ ان کے پاس کمبل، رین کوٹ اور چھتریاں بھی تھیں۔ انہوں نے ہمیں بسکٹ، بٹاٹے وڑے اور سموسے کھانے کو دیئے، پانی دیا اور ربر بوٹ کو دادر کی طرف کھینے لگے۔ دادر میں ایک مقام پر جہاں پانی کم تھا ہمیں ربر بوٹ سے اتار دیا گیا۔ بارش کم ہونے لگی تھی۔ ہماری جان میں جان آئی اور دس پندرہ خواتین کے گروپ کے ساتھ ہم دادر سے باندرہ پیدل پہنچے۔ باندرہ سے لوکل ٹرین مل گئی جس نے ہمیں اندھیری پہنچایا۔ میں اندھیری سے مرول ناکے کی طرف چلنے لگی۔ سڑک سے لوگ پیدل جا رہے تھے۔ میرا بدن درد سے ٹوٹ رہا تھا اور نیند سے آنکھیں بوجھل تھیں۔ گھر پہنچی تو ممی نے گلے سے لگایا۔''

''ممی کا ٹینشن دور ہو گیا ہوگا۔'' شیلی نے پوچھا۔

''ڈیڈی نہیں آئے تھے۔ ممی نے بتایا کہ ان کا کوئی فون نہیں آیا ہے۔'' ویشالی نے کہا۔

ٹرین آہستہ آہستہ رینگنے لگی تھی۔

ویشالی بول رہی تھی:

''میرے ڈیڈی کارپوریشن کی ایمرجنسی ڈیوٹی پر تھے اور جری مری میں بچاؤ کا کام کر رہے تھے جہاں چٹان گرنے سے کئی لوگوں کی موت ہو گئی تھی۔ لیکن لوگوں کو بچاتے ہوئے انہیں ملیریا ہو گیا۔ یہ بیماری بہت دنوں تک چلی اور چھ ماہ پہلے ہی ملیریا سے بابے اسپتال میں ان کی موت ہو گئی۔''

''اوہ مائی گاڈ!.... ہاؤ سیڈ!'' شیلی نے ہمدردی اور رنج کا اظہار کیا۔

''ویشالی تم اوپر سے کتنی شانت نظر آتی ہو لیکن تمہارے اندر کتنی کشمکش ہے۔''

ویشالی نے کہا:

''میرے ڈیڈی ایماندار تھے۔ وہ یونین کے ممبر تھے لیکن غیر ضروری ہڑتالوں میں انہوں نے کبھی حصہ نہیں لیا، اس کا انہیں نقصان بھی اٹھانا پڑا اور ان کی ترقی روک دی گئی۔''

''آج کل تو ایمانداری کا زمانہ ہی نہیں رہا۔'' شیلی نے افسوس کا اظہار کیا۔

ویشالی بولی:

''کاش! میرے ڈیڈی زندہ ہوتے، میں تمہیں ان سے ملاتی، وہ عوامی سپاہی تھے، جو طوفان میں اپنے مورچے پر ڈٹے رہے اور انہوں نے جنگ جیت لی۔ لیکن شیلی میں تمہیں اپنی ممی سے ضرور ملاؤں گی۔''

''ضرور ویشالی۔ تم مجھے اپنا پتہ دو۔''

پھر دونوں نے ایک دوسرے کو پتے اور موبائیل نمبر دیئے۔

شیلی نے کہا:

''ویشالی اس بارش نے ہمیں دوست بنا دیا۔ بارش کا شکریہ''

ویشالی نے کہا:

''لیکن شیلی گذشتہ بارش نے تو ہماری زندگی ہی تباہ کر دی۔ میرے ڈیڈی بارش کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ممی نے کارپوریشن میں نوکری کے لئے درخواست دی۔ وہ گریجویٹ ہیں لیکن ابھی تک کچھ نہ ہوا۔ میں بارہویں پاس ہوں اور نوکری کی تلاش میں ہوں۔''

''ویشالی میرے انکل ایک فیکٹری میں جنرل منیجر ہیں'' شیلی نے کہا، ''میں آج ہی ان سے تمہاری نوکری کے لئے بات کروں گی۔ کارپوریشن نے تمہارے ڈیڈی کا فنڈ وغیرہ دیا یا نہیں؟''

''وہ معاملہ بھی ابھی تک سلجھا نہیں ہے۔ ان کی ایمانداری کی سزا انہیں اس طرح دی جا رہی ہے کہ ان کا فنڈ ابھی تک ریلیز نہیں کیا گیا کچھ تکنیکی رکاوٹیں ہیں۔''

ٹرین اندھیری پلیٹ فارم پر رُکی۔ چاروں طرف روشنی تھی۔ بارش نے جیسے سارے اسٹیشن کو دھو کر صاف کر دیا تھا۔

ویشالی اور شیلی ٹرین سے اتریں۔

ویشالی نے کہا:

''میرے ڈیڈی کے اصول میرے لئے امید کی کرن ہیں۔''

شیلی نے کہا:

''تمہارے ڈیڈی مہاتما تھے۔ گاڈ! ان کی آتما کو شانتی دے۔ لیکن اس بارش نے مجھے ایک اچھی سہیلی دی ہے۔'' اس نے گرم جوشی کے ساتھ ویشالی کو گلے لگالیا۔

''گڈ بائے ویشالی!'' شیلی چلی گئی۔

ویشالی نے سوچا۔ بارش نے شیلی کو سہیلی دی لیکن پتہ نہیں کتنے گھروں کو اجاڑ دیا ہوگا۔ شاید اسی اتار چڑھاؤ کا نام زندگی ہے!

☆☆☆

فسادی :

''سر پر ہتھیار بردار فسادی منڈلاتے رہے اور گڑگڑاتے چہرے پر بن آنسوؤں کی غمناک آنکھیں زندگی کی بھیک مانگ رہی تھیں!''

یک سطری کہانی - ع.ع.خ

لفٹ مین

کاندیولی میں واقع پندرہ بائی پندرہ کی کھولی میں شرد پل کر جوان ہوا اور کسی طرح ممبئی کے فورٹ علاقے کی ایک کمرشیل بلڈنگ میں اسے لفٹ مین کی نوکری مل گئی۔ شرد کے باپ نے اوپر والے کا شکریہ ادا کیا کہ شرد کو جلد ہی نوکری مل گئی ورنہ وہ جن دوستوں کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا، انہوں نے شرد کو چاقو چلانا سکھا دیا تھا۔ باپ نے سمجھایا مارا پیٹا تب کہیں شرد لائن پر آیا۔

دور کے ایک ماما جی فورٹ کے علاقے میں لفٹ مین تھے۔ ایک دن وہ اتفاق سے گھر پر ملنے آئے، سب کی خیریت پوچھی تو پتہ چلا کہ شرد بیکار ہے۔

''شرد کو میرے پاس بھیج دینا'' انہوں نے کہا۔

شرد دوسرے دن ماما جی کے پاس پہنچا۔ وہ اسے بغل والی بلڈنگ میں لے گئے۔ ایک آدمی سے ملایا پھر اپنے ساتھ رکھا، لفٹ کے بارے میں سمجھایا۔ ایک ہفتہ بعد شرد بغل والی بلڈنگ میں جس کا لفٹ مین ریٹائرڈ ہو گیا تھا، کام کرنے لگا۔

بلڈنگ میں چھوٹے چھوٹے کاروباری آفس تھے۔ وہاں دو لفٹ مین ڈیوٹی پر ہوتے تھے۔ جنرل شفٹ میں شرد کی ڈیوٹی لگی۔ تین ماہ بعد وہ Permanent ہو گیا۔

شرد صبح ناشتہ کر کے ایک چھوٹے سے ڈبے میں دو روٹی اور بھاجی لے کر اپنے گھر سے نکلتا اور لوکل ٹرین میں کسی طرح سوار ہو کر وہ چرچ گیٹ اسٹیشن پہنچتا۔ وہاں سے پیدل فورٹ جاتا۔ ڈیوٹی

کرتا پھر شام گھر واپس آ جاتا!

وہ روٹین میں بندھ گیا۔ باپ کی پریشانی دور ہوگئی۔

شرد کا باپ کپڑے کی مل میں بدلی ورکر تھا۔ بدلی ورکر کا مطلب ہوتا ہے مہینے میں کبھی سات دن، کبھی پندرہ دن تو کبھی بیس دن کی پگار! اور کسی مہینے میں وہ بھی نہیں۔ لیکن مل بند ہوگئی تھی اور وہ بے کار ہوگیا۔

ماں جھاڑو برتن کرتی تھی۔

شرد نے الیکٹرک کھمبے کی روشنی میں پڑھ لکھ کر ہندی میونسپل اسکول سے ایس ایس سی پاس کیا تھا۔

پندرہ بائی پندرہ کی کھولی میں شرد سے بڑے دو بھائی بھی ساتھ رہتے تھے۔ دونوں بھائیوں کی دو لڑکیاں تھیں۔ وہ ڈرتے تھے کہ کہیں بیٹے کی چاہت میں بیٹی نہ پیدا ہو جائے؟ ڈر کی وجہ سے ہی بڑے بھائی کی بیوی دو بار اور منجھلے بھائی کی بیوی ایک بار ابارشن کرا چکی تھیں۔ ماں باپ بھی ساتھ ہی رہتے تھے۔

شرد کو پہلے یہ کھولی تنگ لگتی تھی، لیکن اب نہیں۔ بدن چرا کر سونا اور سر جھکا کر کھڑا ہونا اس کی عادت بن چکے تھے۔

ایک دن اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک بہت بڑے لمبے چوڑے گھر میں سویا ہے مگر پاؤں پھیلا کر نہیں بلکہ سکیڑ کے۔

جب جاگا تو سوچنے لگا کہ ایسا کیوں؟ گھر تو بڑا تھا پھر پاؤں پھیلا کر سونے کا خواب اس نے کیوں نہیں دیکھا۔

شرد کا بڑا بھائی نکڑ کی پانی کی دکان پر پان چھانٹنے اور جھاڑو مارنے کا کام کرتا تھا۔ منجھلا بھائی ایک ربر فیکٹری میں حمالی کرتا تھا۔ دونوں کی بیویاں گوری چٹی اور بھرے بھرے بدن والی تھیں۔

مشکل یہ تھی کہ اس تنگ کھولی سے کوئی نکلنا چاہتا نہیں تھا۔ باپ نے کھولی برسوں پہلے خریدی

تھی۔ اس سے بڑا گھر وہ زندگی میں نہیں خرید سکے۔ لڑکوں نے بھی کوئی گھر نہیں خریدا۔ سبھی اس تنگ کھولی میں رُکے ہوئے تھے اس آس پر کہ ان میں سے کوئی تو تنگ آ کر کھولی چھوڑ دے گا۔

باپ نے بہت پہلے، جب شرد چھوٹا تھا تو یہ کہا تھا کہ کھولی شرد کو ہی ملے گی۔ شرد اب سوچتا کہ جب باپ نے کہا کہ کھولی کا حقدار وہ ہوگا تو کیوں نہ وہ گھر کے سارے افراد کو کھولی سے نکال کر باہر کرے۔ مگر اب باپ شرد کے حق میں نہیں تھے، کیوں کہ اب وہ بوڑھے اور نحیف ہو چکے تھے اور کام کرنے کے لائق نہ تھے، وہ کسی سے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ کھولی چھوڑ دیں، کیوں کہ تینوں لڑکوں کی آمدنی سے گھر چلتا تھا۔

روز ڈیوٹی پر چڑھتے ہوئے شرد لفٹ کے اندر بھگوان کی تصویر پر پھول مالا چڑھاتا پھر اگربتی جلا کر پرارتھنا کرتا تاکہ لکشمی اس پر کسی دن کرپا کرے۔

لفٹ میں سوار شرد دن بھر اوپر نیچے ہوتا رہتا اس لئے تھک جاتا اور شام کو تھکا ہارا اڈے پر جا کر نوٹاک لگاتا اور بٹاٹا وڑا منہ میں ڈال کر اسٹیشن کی طرف چل دیتا۔

لفٹ مین کی نوکری کرتے ہوئے شرد کو ایک سال ہو گیا تھا۔ لفٹ اسے اپنی کھولی کی طرح لگتی، اتنی ہی تنگ اور اتنی ہی بند۔ شاید اسی لئے اسے لفٹ سے اپنے گھر ہی کی سی انسیت ہو گئی تھی۔ اس دوران وہ مراٹھی، گجراتی اور سندھی زبانیں بھی سمجھنے لگا تھا مگر بول نہیں سکتا تھا۔ دیوالی، دسہرے، کرسمس اور نیو ایئرس پر اسے بخشش ملتی۔ اسے لفٹ میں چڑھنے اترنے والوں کو نمستے کرنا پڑتا، وہ جتنا زیادہ نمستے کرتا اتنی ہی زیادہ اسے ٹپ ملتی۔ وہ ٹپ کے پیسوں سے شراب پیتا۔ اگر وہ شراب نہ پیے تو تنگ کھولی میں سو بھی نہ سکے۔

موری میں برتن بھی دھوئے جاتے اور اس پر پردہ بھی پڑا رہتا۔ کچرا اٹک جانے سے موری بھر جاتی، بدبو پھیل جاتی۔ کپڑے وہ لوگ دروازے کے آگے بہنے والی نالی پر دھوتے۔ کبھی کبھی نل پر پانی بھرنے پر ہاتھا پائی ہو جاتی تھی۔

اک دن شرد شراب پیئے بغیر اپنی کھولی پر چلا گیا۔ کھولی میں کافی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ لڑکیوں پر بگڑا۔

''کیوں گھر میں گندگی پھیلاتی ہو۔ایک تو موری میں پیشاب کرتی ہو اور اوپر سے پانی نہیں ڈالتی؟''

شرد کو کسی نے پلٹ کر جواب نہیں دیا، وہ پیسہ کما کر جو لاتا تھا۔

شرد کو جو تنخواہ ملتی وہ تمام گھر پر دے دیا کرتا تھا اور اپنے ذاتی خرچ کے لئے ادھار سے کام چلاتا۔ کبھی کبھی مس دارو والا اسے ادھار دے دیتی۔ مس دارو والا جب بھی اس کی لفٹ میں چڑھتی اس کا حال پوچھتی۔

''کیم چھے گھیر ماں بدھا؟'' (کیسے ہیں گھر میں سب؟)

''ٹھیک ہے'' شرد جواب دیتا۔

''لگن کارے کرشے؟'' (شادی کب کرو گے؟)

وہ اس سوال پر مسکرا کے رہ جاتا۔ وہ سوچتا مس دارو والا نے شادی نہیں کی پھر اس سے کیوں بار بار پوچھتی ہے کہ شادی کب کرو گے؟ ویسے مس دارو والا نے شرد کو کئی بار گھر پر آنے کی دعوت دی تھی لیکن وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال گیا تھا۔

''آ لے پیسہ، پوریاؤ ماٹے مٹھائی لئی ججے'' (یہ لے پیسے، بچوں کے لئے مٹھائی لے جانا۔)

''جو دارو نئی پیتو سمجھیو کہ!'' (دیکھ دارو نہیں پینا سمجھا کیا)

''نہیں پیوں گا میڈم''

جب مس دارو والا چلی جاتی تو وہ دل میں کہتا:

''دارو والا مجھے دارو پینے سے منع کیوں کرتی ہے؟''

وہ طرح طرح کے خواب دیکھتا جن میں نوٹوں سے بھرے باکس ہوتے۔ مس دارو والا میڈم جیسی لڑکیاں ہوتیں۔ وہ بڑے بڑے گھر اور فلک بوس شاندار عمارتیں دیکھتا۔ خواب سے بیدار ہوتا تو سوچتا، سالا کہیں بڑا ہاتھ مارنا چاہئے۔ سوچتا اس لفٹ میں اوپر نیچے ہوتے ہوتے وہ مر جائے گا اور خواب کبھی پورے نہیں ہو سکیں گے۔

ماں کے بائیں حصے پر فالج مار گیا تھا۔

ماں کی تیمارداری پر جب کبھی بھائیوں کی بیویوں میں جھگڑا ہوتا تو آس پاس کے تمام لوگ انہیں عبرت دلاتے۔

شرد کو ہنستی کھلکھلاتی لڑکیاں پسند تھیں ۔ وہ سوچتا، لفٹ میں چڑھنے والی ان لڑکیوں کو کیا کبھی دُکھ نہ ہوتا ہوگا؟ ایسی لڑکیوں میں سے کوئی اس کی بیوی نہ بن سکے گی؟

دھت! وہ اپنے آپ سے کہتا، لفٹ مین سے تو کوئی جھاڑو والی ہی بیاہ کر سکتی ہے۔

مایا جھاڑو والی بلڈنگ میں جھاڑو لگاتی، جگہ جگہ تھوکتی اور کولہے مٹکاتی چلتی ۔ اکثر لفٹ کے پاس کھڑے شرد یہ تماشا دیکھتا رہتا۔

لفٹ میں ہر قسم کے لوگ چڑھتے تھے۔ لیکن امیروں کے چہرے چمک رہے ہوتے ۔ ان کی کلائیوں میں قیمتی سنہری گھڑیاں ہوتیں، گلے میں سونے کی چین، انگلیوں میں قیمتی پتھروں والی انگوٹھیاں، وہ عمدہ سینٹ میں مہک رہے ہوتے ۔ وہ سوچتا، ایک آدھ کے گلے پر چاقو ہی پھیر دوں۔

''گھر کی ذمہ داری مجبور کرتی ہے ورنہ اپنا دماغ تو اچھی بات سوچنے سے مجبور ہے۔''

ایک دن:

لفٹ میں کوئی شخص اپنے کالے رنگ کا بریف کیس چھوڑ گیا۔ دانستہ یا نادانستہ ۔ پتہ نہیں؟ شرد نے بریف کیس اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ سوچا، وہ شخص واپس آئے گا تو دے دے گا مگر وہ شخص واپس نہیں آیا۔

شرد کو فکر ہوگئی ۔ کہیں بریف کیس لوٹ کے نوٹوں سے تو نہیں بھرا ہوا ہے؟ ہو سکتا ہے پولس اس شخص کے پیچھے لگی ہو اور اس نے بریف کیس لفٹ میں چھوڑ دیا ہو؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ بعد میں آ کر وہ بریف کیس لے جائے؟ پھر ایک خیال اس کے دماغ میں طوفان کی طرح در آیا۔ اگر اندر بم ہوا تو؟ اور وہ کانپ کر رہ گیا۔

گذشتہ دنوں ہی شہر میں بم دھماکے ہوئے تھے، وہ جانتا ہے کہ اتنے بڑے شہر میں روزانہ ہی بے گناہ انسانوں کو ہلاک اور زخمی کیا جا رہا ہے، عوامی املاک و جائیداد تباہ کی جا رہی ہے اور چاروں طرف خوف و ہراس پیدا کرنے کے لئے طرح طرح کی افواہیں بھی پھیلائی جا رہی ہیں ۔ شہر میں فی الحال ریڈ الرٹ ہے اور جگہ جگہ پولس نے ناکہ بندی کر رکھی ہے۔

طرح طرح کے خیالات اس کے دماغ میں ابھرنے لگے۔ وہ سوچنے لگا، اگر بریف کیس پولس کے حوالے کردوں تو؟ یا بلڈنگ لینڈ لارڈ کو دے دوں تو؟ لیکن اگر نوٹ ہوئے تو لینڈ لارڈ کھا جائے گا۔ پولس والوں کا بھی کیا بھروسہ، کہیں اپن کو تکلیف نہ ہو جائے؟

لیکن اگر بم ہوا تو؟ وہ پھر کانپ گیا۔ پوری بلڈنگ ڈھے سکتی ہے۔ کیا کرے کیا نہ کرے اسی ادھیڑ بن میں وہ لگا رہا۔

ڈیوٹی ختم ہونے والی تھی اور دوسرے لفٹ مین کے آنے کا وقت بھی ہو رہا تھا۔ اس نے بریف کیس کی طرف دیکھا، اسے دھیرے سے اٹھایا اور جنریٹر روم کی طرف چل پڑا۔ جنریٹر روم میں جاتے ہوئے اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ جنریٹر روم میں ایک جگہ بریف کیس چھپا کر جب وہ واپس آیا تو سوچنے لگا، اگر بم پھٹا تو کیا ہوگا؟ اگر نوٹ ہوئے تو زندگی میں بہار ہی بہار سمجھو۔ جوا کھیل ہی لیا جائے۔ زندگی جوا ہی تو ہے۔

دوسرا لفٹ مین آچکا تھا۔ اسے ذرا اطمینان ہوا اور وہ ڈیوٹی کا چارج اسے سونپ کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

رات اسے دیر تک نیند نہ آئی۔ طرح طرح کے اچھے برے خیالات ستا رہے تھے۔ گھر آتے ہوئے شرد نے حسب معمول شراب پی رکھی تھی مگر نشہ اسے ذرا بھی نہ چڑھا تھا۔ کسی طرح جب اسے نیند آئی تو خواب میں بم پھٹتا ہوا اور بلڈنگ کے پرخچے اڑتے نظر آئے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، پسینے سے شرابور۔

پھر رات بھر وہ کروٹ بدلتا رہا۔

صبح جب فورٹ میں اپنی بلڈنگ کے سامنے آیا اور بلڈنگ کو صحیح سلامت دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ بریف کیس میں یا تو سونے کے بسکٹ ہیں یا نوٹوں کی گڈیاں۔

اسے اطمینان ہوا۔

دن بھر وہ اپنے کام میں مشغول رہا۔

ڈیوٹی ختم ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے اس نے ٹول باکس میں سے اسکریو ڈرائیور نکال کر جیب

میں ڈالا اور بھگوان کی تصویر کے آگے جھکا اور پرارتھنا کی کہ بھگوان اس کی رکشا کرے۔

جنریٹر روم میں جا کر اس نے چھپائی ہوئی جگہ پر سے بریف کیس نکالنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

بریف کیس غائب تھا۔

☆☆☆

پریکٹس :

"وہ جھکتا نہیں تھا، جب اُسے معلوم ہوا کہ اکڑن کی وجہ سے مردے جھکتے نہیں تو اس نے جھکنے کی پریکٹس شروع کر دی!"

یک سطری کہانی - ع.ع.خ

لائف لائن

۱۱ر جولائی ۲۰۰۶ء :

کبھی نہ تھمنے والا شہر ممبئی آج چند لمحوں کے لئے اس وقت ٹھہر گیا جب عروس البلاد کی لائف لائن کہی جانے والی لوکل ٹرینوں کی ویسٹرن لائن پر ماٹنگا سے میرا روڈ تک ۱۱ر منٹ میں یکے بعد دیگر ۸ر بم دھماکے ہوئے۔ سات دھماکے لوکل ٹرینوں کے فرسٹ کلاس ڈبوں میں اور ایک دھماکہ بوریولی اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ایک پر۔ کتنے ہی لوگ بموں کی آواز کے سبب اپنی قوتِ سماعت سے محروم ہوگئے۔ ۱۹۰ر افراد کی جانیں گئیں اور ۲۵۰ر افراد زخمی ہوگئے۔ یہ لوگ اپنے گھر اور سماج کا قیمتی سرمایہ تھے۔ معاشیات کو بڑھاوا دینے میں یہ لوگ پیش پیش تھے۔ ان میں ہیرے وزیورات کے بیوپاری تھی۔ کمپنیوں کے اعلیٰ افسر تھے۔ یہ لوگ کسی کے بیٹے، کسی کے شوہر، کسی کے بھائی، کسی کے باپ تھے۔ ان میں، کسی کی بیٹیاں، کسی کی بیویاں، کسی کی بہنیں تو کسی کی مائیں بھی تھیں۔ لیکن صرف ۱۱ر منٹ کے وقفے میں ۸ر بم دھماکوں نے ان کی دنیا اجاڑ دی تھی۔

اول کے دو دھماکے باندرہ اور کھار اسٹیشنوں پر چھ بج کر ۲۴ر منٹ پر ہوئے، اس کے ایک منٹ بعد چھ بج کر ۲۵ر منٹ پر جوگیشوری اور دو منٹ بعد چھ بجکر ۲۶ر منٹ پر ماہم کا اسٹیشن دھماکوں سے لرز اٹھا۔ میرا روڈ پر بھی چھ بج کر ۲۹ر منٹ پر دھماکہ ہوا جبکہ ماٹنگا پر ٹھیک ساڑھے چھ بجے اور بوریولی پر چھ بج کر ۳۵ر منٹ پر آخری دھماکہ ہوا۔

ٹیلی کام انجینئر مسٹر فرنانڈیز ہمیشہ کی طرح اپنی کمپنی سے نکلے اور چرچ گیٹ پہنچ کر ٹرین کے فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سوار ہوئے۔انہوں نے آج بچوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ شام میں انہیں گھمانے لے جائیں گے اور ڈنر کسی اچھی سی ریستوران میں انہیں کھلائیں گے۔لیکن موت تھی کہ ان کا پیچھا کر رہی تھی۔

گھر میں بم دھماکوں کی خبر آچکی تھی اور فرنانڈیز کے اہل خانہ تشویش میں مبتلا تھے۔رات ۱۲ ربجے بھگوتی اسپتال سے فون آیا کہ فرنانڈیز کی موت ہوگئی ہے۔فون ان کے دوستوں نے کیا تھا جو روزانہ ان کے ساتھ ٹرین میں سفر کیا کرتے تھے۔

.........بچوں کے خواب چکنا چور ہو گئے۔

.........بیوی روتے روتے پچھاڑ کھا کر گری اور بے ہوش ہوگئی۔

ارشد کسی سماجی تنظیم کا رکن نہیں تھا لیکن انسانیت کی خاطر مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنے میں اسے روحانی خوشی محسوس ہوتی تھی اور وہ نیکی کے کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔جب باندرہ اور کھار کے بیچ لوکل ٹرین کے فرسٹ کلاس میں بم بلاسٹ ہوا تو وہ اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ایک پر اپنے دوست کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔پلیٹ فارم نمبر چار سے ویرار کی گاڑی چلی اور ذرا دور ہی پہنچی ہوگی کہ ایک دل دہلا دینے والا دھماکہ ہوا، آگ کا بھبکا اٹھا اور پھر چاروں طرف کالے دھوئیں کے ساتھ بارود کی بو پھیل گئی۔اسٹیشن اور آس پاس کا علاقہ لرز گیا تھا۔قریبی بلڈنگوں کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ٹیلی فون اور موبائیل سروس بند ہوگئی تھی۔دھماکہ اتنا شدید تھا کہ اسٹیشن کی چھت اڑ گئی۔

دھماکہ ہوتے ہی ٹرین رک گئی۔چاروں طرف افراتفری کا عالم تھا۔لوگ ڈبوں سے کود کود کر اپنی جانیں بچا رہے تھے۔ہاہا کار مچی ہوئی تھی۔ارشد نے دوست کو الوداع کہا اور باندرہ ایسٹ میں نوپاڑہ پر اپنے گھر دوڑا گیا اور گھر سے کیمرہ لے آیا۔اس کے اندر کا سوشل ورکر جاگ اٹھا تھا اور وہ گھوم گھوم کر جائے واردات کی تصویریں لینے لگا۔جس ڈبے میں بلاسٹ ہوا تھا اسکے پرخچے اڑ گئے تھے۔چاروں طرف انسانی اعضاء اور خون پھیلا ہوا تھا۔ڈبے کے نیچے پٹریوں پر کسی کا کٹا ہوا ہاتھ، کسی کا کٹا ہوا پیر اور چند زخمی اشخاص بے یارو مددگار پڑے تھے۔

کملیش دو نمبر پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ بم کے دھماکے سے اڑتا ہوا ٹرین کے ڈبے کا ایک ٹکڑا اس کے پیر کو اتنی شدت سے لگا کہ اس کا داہنا پیر ٹخنے کے پاس سے کٹ گیا اور دوسرا پیر شدید زخمی ہوگیا۔ جب اسے اسپتال لے جایا گیا تو ڈاکٹروں کو اس کی جان بچانے کے لئے ٹخنے سے اس کا بایاں پیر بھی کاٹنا پڑا اور وہ معذور ہوگیا۔

لوگ مدد کے لئے چیخ رہے تھے۔

چاروں طرف سے "بچاؤ...... بچاؤ" کی آوازیں آرہی تھیں۔

لوگ رو رہے تھے۔ ارشد نے دو چار لوگوں کی مدد سے بچاؤ کا کام شروع کیا۔ ارشد کے ساتھ ڈیسوزا بھی تھا اور بھاسکر بھی، پانڈورنگ بھی تھا اور بھجن سنگھ بھی۔ ان لوگوں نے فرسٹ کلاس میں سیٹ کے گدّوں پر زخمیوں کو رکھا اور انہیں ڈبے سے نکالنا چاہا تبھی زوردار بارش شروع ہوگئی اور سیٹ سے زخمی پھسل کر نیچے گرنے لگے۔ یہ سب لوگ انسانی جذبے کے تحت کام کر رہے تھے۔

تب تک کچھ میڈیا والے نظر آئے لیکن دور دور تک پولس والے اور انتظامیہ کا کوئی افسر نظر نہیں آرہا تھا۔

ایک شخص کو بچاتے ہوئے جیسے ہی ارشد نے اس کی ٹائی کھینچی پتہ چلا اسے سر ہی نہیں ہے۔ چاروں طرف سامان بکھرا تھا۔ ننگی بے دھڑ اور بے سر کی لاشیں پڑی تھیں، جنہیں اٹھا کر وہ لوگ باہر لے جا رہے تھے۔

سائن اسپتال میں زخمیوں کے گھر والوں اور ورثاء کی بھیڑ لگی تھی۔ ایسا ہی حال اور کئی سرکاری اور نجی اسپتالوں کا بھی تھا۔ روتے بلکتے لوگ اپنے چہیتوں کی تلاش میں کبھی بھگوتی اسپتال، کبھی کوپر اسپتال، کبھی کے ای ایم اسپتال، کبھی بھابھا اسپتال کے چکر لگا رہے تھے۔ لوگ اسپتالوں کے مردہ گھروں میں لاشوں کے انبار میں اپنے چہیتوں کو ڈھونڈ رہے تھے اور جب انہیں اپنے چہیتے نہ ملے تو وہ دھاڑیں مار کر رو پڑے، یہ منظر دل دہلانے والا تھا۔ کئی لاشوں کے صرف ہاتھ یا پاؤں ہی باقی رہ گئے تھے۔

اسپتالوں کے باہر لوگ قطار میں کھڑے رہ کر زخمیوں کو خون کا عطیہ دے رہے تھے۔ ان میں

کسی مذہب کا بھید بھاؤ نہیں تھا۔صرف انسانیت کا رشتہ تھا، کیونکہ سبھی کا خون سرخ تھا۔دوائیوں کے لئے ایک صنعتکار نے اسپتالوں کو خطیر رقم بطور عطیہ دی تھی اور وہ زخمیوں کو بھی علاج کے لئے پیسے تقسیم کر رہا تھا۔اس کا کہنا تھا کہ اگر اس کے دیئے ہوئے پیسوں سے کسی ایک زخمی کی بھی جان بچ گئی تو وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھے گا۔

سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

لائف لائن دھڑکتے دھڑکتے رک گئی تھی۔

جوگیشوری میں سشمیتا نے صبح اپنے بھائی کملاکر کے ٹفن میں کھانا رکھ دیا تھا۔اس امید کے ساتھ کہ شام میں بھائی کے ساتھ سب بیٹھ کر کھانا کھائیں گے، اس نے بھائی کا پسندیدہ سویٹ ڈش گاجر کا حلوہ بھی تیار کر لیا تھا۔لیکن شام کے بعد چولہا جلانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

جوگیشوری میں مقامی خدمت گار اور سوشل ورکر بڑی بڑی چادروں میں کٹی ہوئی لاشیں اور لاشوں کے ٹکڑے جمع کر رہے تھے۔زخمیوں کو اسپتال بھیجا جا رہا تھا۔دکانوں، مکانوں اور گلی کوچوں سے نوجوان باہر آ گئے تھے اور کراہتے لوگوں کو اسپتال پہنچانے کا کام جاری تھا۔

ایک شخص نے کہا:

''میں نے لاشوں کا ڈھیر دیکھا ہے۔'' اتنا کہہ کر چیخ چیخ کر اس نے اپنے بال نوچنے شروع کر دیئے۔

علاقے کے صاحب حیثیت لوگوں نے اپنی پرائیویٹ گاڑیاں زخمیوں کو اسپتال پہنچانے پر لگا دی تھیں۔

ایک شخص دھماکے والی ٹرین کے ڈبے سے باہر آیا۔اس کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے تھے، لیکن شاید وہ انجان اپنے گھر کی طرف دوڑ رہا تھا اور کہہ رہا تھا:

''مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے۔''

..........کیا وہ گھر پہنچ پایا ہوگا؟

ویسٹرن لائن پر کچھ دیر کے لئے لوکل سروس بند ہوئی تو تمام سڑکیں موٹر گاڑیوں کے ٹریفک

سے جام ہوگئیں۔ گاڑی والوں نے لوگوں کو بٹھا کران کے ٹھور ٹھکانوں تک پہنچایا، کسی نے یہ کام بے غرض ہمدردی کے تحت کیا تو کسی نے موقع کا فائدہ اٹھایا۔ ایسے میں سڑک کے کنارے آباد بلڈنگوں سے خواتین، کالج اسکول کے طالب علم، بچے بوڑھے باہر نکل آئے جو پریشان لوگوں کو بسکٹ، وڑا پاؤ، کیلے، چوڑا، پانی اور چائے تقسیم کر رہے تھے۔

ایسا لگتا تھا جیسے ممبئی کے لوگوں کی آپسی محبت اور خلوص ہی اس شہر کی سب سے بڑی طاقت ہے اور یہ شہر اسی خدمت کے جذبے کے تحت زندہ ہے۔ کہاں ہیں وہ جھوٹے لوگ جو ممبئی شہر کے باسیوں پر غلط رائے قائم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ممبئی دنیا کا سب سے بے مروت اور نامہربان شہر ہے۔ ممبئی میں ۲۶ / جولائی ۲۰۰۵ء میں بھی اس طرح کا انسانی جذبہ شہر کے لوگوں میں دیکھا گیا تھا جب وہ انسانیت کے جذبے سے مغلوب ہو کر ایک دوسرے کی مدد کر رہے تھے۔ اس دن بھی قیامت برپا تھی اور شدید بارش میں شہر ڈوب رہا تھا اور میٹھی ندی میں سیلاب آگیا تھا۔

دہلی سے بڑے بڑے لیڈر آئے جنھوں نے ممبئی کے لیڈروں کے ساتھ جائے واردات کا معائنہ کیا۔ افسوس کا اظہار کیا۔ اسپتالوں میں جا کر زخمیوں کی عیادت کی، نقصان کی بھرپائی کا اعلان کیا۔ ریلوے نے ۵ / لاکھ روپئے مرنے والوں کو، ۵۰ / ہزار روپئے ہر زخمی کو مع میڈیکل اخراجات دینے کا اعلان کیا۔ مہلوک کے گھر کے ایک فرد کو ریلوے میں سروس دلانے کا ذمہ بھی لیا گیا۔ ریاستی سرکار نے بھی ہر مرنے والے کو ایک لاکھ روپئے دینے کی بات کہی۔ صدر جمہوریہ نے بم دھماکوں میں مرنے والوں کو خراج عقیدت پیش کیا اور ان کے پسماندگان اور لواحقین کے لئے تعزیتی الفاظ کہے۔

جب تمام زخمیوں کو اسپتال بھیجا جا چکا اور تمام لاشیں اٹھالی گئیں، تب کہیں انتظامیہ کا عملہ جائے وقوعہ پر نظر آیا۔

ارشد نے سوچا:

وہ بھی فرسٹ کلاس میں سفر کرتا ہے۔ خدانخواستہ ان میں سے کسی ایک میں اگر وہ بھی سوار ہو گیا ہوتا..........

ٹیلی کام انجینئر مسٹر فرنانڈیز کے پرتگالی طرز پر بنے کاٹج کے سائبان تلے تابوت گاڑی

کھڑی تھی۔ کاٹج کے دالان میں ایک ٹیبل پر عمدہ لکڑی کا بنا تابوت رکھا ہوا تھا اور تابوت کے گہرے خانے میں مسٹر فرنانڈیز سوئے ہوئے تھے۔ انہیں ٹریسا فرنانڈیز سے شادی کے موقع پر سلایا ہوا سوٹ پہنایا گیا تھا اور دونوں ہاتھ سینے پر جوڑ کر تعزیت کے لئے آئے ہوئے عزیزوں اور رشتے داروں سے ممنونیت کا اظہار کر رہے تھے۔ وہاں آنے والوں کو معلوم ہی نہ تھا کہ انہوں نے اپنے بال بچوں سے کیسا سہانا وعدہ کیا تھا۔ موم بتیاں رو رہی تھیں، دھواں چکرا رہا تھا۔ اور ہر طرف ایک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

☆☆☆

عام آدمی :

''آج کا عام آدمی ہر طرف ان دیکھی چھڑی سے مار کھا رہا ہے اور بے رحم دنیا اندھی بہری گونگی تماشائی بنی ہوئی ہے!''

یک سطری کہانی - ع.ع.خ

کھلونے

لیڈی ڈاکٹر شرمیلا کار سے اتر کر سینٹ جارج اسپتال کی وسیع و عریض تاریخی عمارت میں داخل ہوئی۔ بچوں کا اسپیشل وارڈ عمارت کی پچھلی جانب تھا اور شرمیلا کو جلد سے جلد وہاں پہنچنا تھا۔

وہ اسپتال کے لمبے چوڑے دالانوں سے گزرنے لگی۔

ڈاکٹر شرمیلا کی دس سالہ طبی زندگی میں کئی طرح کے مریض آئے تھے لیکن ان دنوں اسے چائلڈ پیشنٹ اویناش میں انوکھا پن محسوس ہوا تھا۔ ڈاکٹر شرمیلا کا منگیتر پائلٹ چند برس قبل ہوائی حادثے میں چل بسا تھا، تب سے وہ بیوگی کی چادر اوڑھے تھی۔ کئی لوگوں نے اسے دوسری شادی کرنے کو کہا مگر اس نے پھر شادی نہیں کی۔ دس سالہ اویناش کی چمکدار آنکھوں میں ایسی کشش تھی کہ ڈاکٹر کی مکمل توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی تھی اور پتہ نہیں اسے کیوں ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ بچہ اس کے اندر چھپے ہوئے ممتا کے جذبے کو ابھار رہا ہو! ایسا تجربہ اسے پہلی بار ہوا تھا اور وہ حیرت زدہ رہ گئی تھی۔

پرانی روایت کے مطابق دنیا میں پھانسی پر چڑھائے جانے سے پہلے مجرموں کی آخری خواہش پوچھی جاتی اور اسے پورا کیا جاتا تھا۔ جو بچے کینسر یا ایڈز جیسے لاعلاج مرض میں مبتلا ہوں ان کی بھی آخری خواہش پوری کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ایک رضا کار تنظیم ”میک اے وِش

فاؤنڈیشن آف انڈیا'' نے ڈاکٹر شرمیلا کو خط لکھ کر بتایا تھا کہ اگر ایسا کوئی معاملہ ہو تو ان کی تنظیم مدد کرے گی۔ ڈاکٹر مریض سے اس کی آخری خواہش دریافت کرے جیسے یوروپ کی سیر، شہر کی فضاؤں میں ہوائی پرواز یا پھر کسی مشہور اداکار سے ملاقات! یہ تنظیم اسی طرح کا کام کرتی تھی۔

شرمیلا اسپتال کی بارہ دری سے گزرتی اور سر ہلا کر وارڈ بوائے اور نرسوں کے نمسکار کا جواب دیتی رہی، سہیلیوں اور ساتھی ڈاکٹروں نے بھی اسے ''ہلو-ہائے'' کہا، لیکن شرمیلا کے قدموں کی تیزی دیکھ کر اسے کسی نے نہیں روکا۔

او پی ڈی میں اسٹریچر پر پڑے زخمی لوگوں کی چیخ و پکار، ان کے رشتے داروں کا رونا دھونا، زخموں سے رستا خون و مواد، ایک ہی طرح کی بُو، اس نے سوچا، زندگی کے لطیف جذبات و احساسات سے بہت دنوں تک دور نہیں رہا جا سکتا۔ وہ بنیادی طور پر پہلے ایک عورت ہے بعد میں ایک ڈاکٹر۔ پھر وہ انسانی جذبات سے بچ کیسے سکتی ہے؟

اویناش اور اس کا باپ جس اسپیشل وارڈ میں تھے وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اویناش کا باپ کوتاہ قد لیکن مضبوط جسم کا مالک تھا اس نے ڈاکٹر شرمیلا کو کافی متاثر کیا تھا۔ وہ پینتیس برس کا ہوگا۔ اس کے بدن کی تراش خراش، اس کی بے پناہ طاقت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اُس کے بدن میں جیسے سورج کی حرارت اور تمتماہٹ سی سمائی ہوئی تھی۔ وہ کسان تھا اور صرف بنگالی زبان جانتا تھا جس سے شرمیلا لاعلم تھی۔ دونوں کے درمیان اشاروں کنایوں میں گفتگو ہوتی تھی۔

ڈاکٹر شرمیلا کو پتہ چلا تھا کہ یہ بنگالی کسان کچھ ہی دن پہلے روزی روٹی کمانے کے لئے ممبئی آیا تھا اور اسپتال سے کچھ ہی دور کرافورڈ مارکیٹ کے علاقے میں فلائی اوور کے نیچے رہتا تھا۔ وہاں نچلے طبقے کے لوگوں کا جمگھٹا سا لگا رہتا۔ کاروں کے پیچھے بیٹھے کچھ لوگ شراب، چرس، گانجہ تو کچھ لوگ چادر اوڑھے گرد پینے اور Syringe سے نشیلی دوائیاں جسم میں داخل کرتے رہتے۔ پولس کمشنر کا آفس اس فلائی اوور سے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ وہ غریب تھا مگر اپنے بیمار بچے کا مکمل علاج کرانا چاہتا تھا۔ ایک دن وہ اسپتال کے او پی ڈی میں ڈاکٹر سے رجوع ہوا، ڈاکٹر نے اسے بچے کو اسپتال میں داخل کرنے کے لئے کہا اور یہ کیس شرمیلا کے ذمہ آ گیا۔ اویناش Muscular Dystrophy (عضلاتی نقص) کی بیماری کے سبب معذور ہو گیا تھا۔ وہ نہ کسی سہارے کے بغیر کھڑا رہ سکتا تھا اور نہ ہی بیٹھ سکتا تھا۔

اوِیناش کا چہرہ کافی پُرکشش تھا۔ وہ تندرست پیدا ہوا اور معمول کے مطابق عام بچوں کی طرح کھیلتا کودتا تھا لیکن آہستہ آہستہ اس کے پیروں میں ناتوانی اور کمزوری آتی گئی اور وہ اس حالت کو آپہنچا۔ ڈاکٹر شرمیلا اس کیس میں کافی دلچسپی لینے لگی تھی۔ اس نے کئی ماہر ڈاکٹروں سے بچے کی بیماری پر ڈسکس کی تھی اور چاہتی تھی کہ کوئی ایسا علاج کوئی ایسا نسخہ ہاتھ آجائے جو اوِیناش کی زندگی بچالے، لیکن ابھی تک یہ ممکن نہ ہوسکا تھا۔ ڈاکٹر بیماری پر ریسرچ کرنا چاہتے تھے لیکن بیماری آخری اسٹیج پر تھی اس وجہ سے ان کا یہ مقصد پورا نہ ہوسکا تھا۔

اوِیناش کی مسکراہٹ ڈاکٹر شرمیلا کو مونالیزا کی سراسر مسکراہٹ جیسی لگتی تھی۔ کاش! اوِیناش کی مسکراہٹ کے ساتھ بھی کوئی لیونارڈو وِنچی انصاف کرتا!

باپ بیٹے دن بھر آپس میں اس طرح بات چیت کرتے جیسے انہیں دنیا کی فکر نہ ہو اور نہ کسی سے کوئی سروکار! وہ دونوں ہنستے کھلکھلاتے رہتے۔

شرمیلا سوچتی، وہ اس قدر کیوں ہنستے ہیں؟

ڈاکٹر شرمیلا کے لئے یہ بڑا مشکل مرحلہ تھا کہ باپ کو یہ بتایا جائے کہ اس کا بچہ کچھ ہی دنوں کا مہمان ہے۔ اکثر ڈاکٹر اس طرح کے مرحلے سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں لیکن دل پر جبر کر کے ڈاکٹر شرمیلا نے اشاروں میں بچے کے باپ کو اس تلخ حقیقت سے آگاہ کردیا۔

جب تلخ حقیقت سے باپ کا سامنا ہوا تو ڈاکٹر شرمیلا نے پہلی بار بچے کے باپ کو زار و قطار روتے دیکھا اس قدر کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں اور اوِیناش سر جھکائے بیٹھا رہا۔

ڈاکٹر شرمیلا بس اب اوِیناش کے اسپیشل وارڈ کے قریب تھی اور اس کے ذہن میں گزرے ہوئے لمحات کسی فلم کی طرح چل رہے تھے۔

وہ آخر کس طرح یہ بات اوِیناش کے باپ سے کہے گی کہ اوِیناش کی آخری خواہش پوری کرنے کے لئے رضا کار تنظیم نے ڈاکٹر کی تجویز منظور کرلی ہے اور یوروپ کی سیر و سیاحت کے لئے اوِیناش اور اس کے باپ کا نام درج کرلیا ہے۔

اب ڈاکٹر شرمیلا اسپیشل وارڈ کے دروازے پر کھڑی تھی، لیکن وہ اوِیناش کا بیڈ خالی دیکھ کر

چونک گئی، وہ کرسی بھی خالی تھی جہاں اویناش کا باپ بیٹھ کر دنیا سے بےخبر گھنٹوں اپنے بیمار بیٹے سے باتیں کیا کرتا تھا، جو ڈاکٹر شرمیلا کی سمجھ سے بالاتر تھیں البتہ ان کا چھوٹا ٹرنک وہاں موجود تھا۔

''کہاں گئے دونوں؟'' شرمیلا کے ذہن میں سوال گونجا، ''کیا کسی فطری ضرورت کے تحت....؟''

تبھی ڈاکٹر شرمیلا کے پیچھے ڈیوٹی پر تعینات نرس آ کر کھڑی ہوئی اور بولی:

''ڈاکٹر! یہ لوگ صبح سے یہاں موجود نہیں ہیں!''

شرمیلا کو اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ اویناش کا باپ اپنے بیٹے کو لے کر اسپتال سے جا چکا ہے۔

اس نے فرش پر رکھا وہ چھوٹا ٹرنک اٹھا کر بیڈ پر رکھا۔ خود بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ پھر اس نے آہستگی سے ٹرنک کھولا۔ اس میں طرح طرح کے کھلونے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔

شرمیلا نے سوچا، ہماری زندگی میں ایک ایسا بھی وقت آتا ہے کہ جب ہمیں کسی کھلونے کی ضرورت نہیں ہوتی، کیوں کہ ان کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ ہم اُن سے نہیں بہلتے۔

☆☆☆

تصویر:

''بیٹا! رسالے کے سرورق پر تمہاری تصویر شائع نہیں ہو سکتی، میرے پاس پانچ ہزار نہیں ہیں!''

یک سطری کہانی - ع.ع.خ

گیلری میں کھڑی ہوئی لڑکی

میں کمرے میں اکیلا تھا۔

کمرے کی مغربی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی گرمی تھی۔ کوئی ہوا کا بھولا بھٹکا جھونکا کھڑکی کے راستے اندر آ جاتا۔

اچانک میری آنکھوں میں کچھ چبھ سا گیا، میں چونک گیا۔ اور پھر دھوپ کا ایک چلبلاتا ہوا ٹکڑا در و دیوار پر ناچنے لگا۔ چند لمحوں بعد مجھے احساس ہوا کہ کوئی آئینہ چمکا رہا ہے! میری نظر مغربی سمت والی بلڈنگ پر گئی جو میری کھڑکی سے تیس چالیس قدم کے فاصلے پر تھی اور اچانک میری نظروں نے چوری پکڑ لی۔ ایک خوبصورت گداز لڑکی گیلری میں کھڑی میرے ساتھ یہ دھوپ چھاؤں کا کھیل کھیلنے کی کوشش کر رہی تھی۔

یہ سلسلہ چلتا رہا۔

میرا کمرہ بھی چوتھے منزلے پر تھا اور اسکا فلیٹ بھی۔

ایک دن وہ اشارے کر رہی تھی، پہلے میں سمجھا کہ توجہ کا مرکز میں ہوں مگر بغور دیکھنے پر پتہ چلا کہ نیچے کوئی اور لڑکا کھڑا ہے! اب تو میرے ذہن کی نس پھڑکی۔ لڑکی کا جال لمبا ہے ایک طرف مجھ پر ڈورے ڈال رہی ہے، دوسری طرف کسی اور کو......

میرا ایل ایل. بی. کا آخری سال تھا اس لئے میں نے پوری توجہ اپنی پڑھائی پر لگائی۔ میں نے اب اس لڑکی کے متعلق سوچنا ہی بند کر دیا تھا۔

ایک دن جب میں سڑک سے گزر رہا تھا کہ ایک چھوٹی سی لڑکی نے مجھے خوبصورت سا لفافہ دیا۔ میں گھر آیا دیکھا گیلری میں وہی لڑکی کھڑی مسکرا رہی ہے۔ میں نے لفافہ چاک کیا۔ اندر نیلے کاغذ پر خط لکھا تھا کہ لوگ اسے پاگل اور بیمار سمجھتے ہیں۔ خط سے یہ بھی پتہ چلا کہ وہ اپنی موسی کے ساتھ رہتی ہے اور موسی اس کے لئے دوا، جادو ٹونے، منت مرادوں وغیرہ پر خوب پیسے برباد کر رہی ہیں۔ لیکن کوئی اسکے غم کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا! ہر جمعرات کو صبح نو بجے بمبئی اسپتال کے سائیکیٹرک ڈپارٹمنٹ میں علاج کے لئے جاتی ہے۔ اس نے ملاقات کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اسے ابھی تک ٹرانکولائزر کے علاوہ بجلی کے شاک بھی دیئے گئے ہیں۔ خط کے آخر میں اپنا نام بھی لکھا تھا۔ ''مینا''!

خط پڑھ کر مجھے اس سے ہمدردی ہونے لگی اور میں نے اس کے بارے میں جو غلط خیال بنا لیا تھا وہ ٹوٹ گیا۔

بھابھی کپڑے دھو رہی تھی میرا دماغ منتشر تھا، میں نے بھابھی سے یوں ہی پوچھا:

''بھابھی! کیا شادی سے پہلے آپ کو بھی اکیلا پن کھلتا تھا؟ کیا آپ بھی کسی کے ساتھ .... میرا مطلب ہے کسی کو خط وط لکھتی تھیں؟''

''آخر آپ شرارت سے باز نہیں آئیں گے آنے دیجئے اُنہیں، پھر مزا چکھاتی ہوں۔''

بھابھی بھنویں تان کر بولی۔

''نہیں بھابھی! آپ مانیں یا نہ مانیں۔ سچ کہتا ہوں۔ دراصل بات یہ ہے کہ ایک دوست بے چارہ کشمکش میں مبتلا ہے، اسے ایک لڑکی نے بڑا عجیب خط لکھا ہے وہ مجھ سے مشورہ چاہتا ہے۔''

''میں کیا مشورہ دوں گی۔''

دودھ کچن میں اُبل رہا تھا۔ بھابھی جان چھڑا کر چلی گئی۔ واپس آئی تو مجھ سے کہا:

''بھابھی ہونے کے ناطے اگر میں آپ سے ایک بات کہوں تو برا نہ مانیئے گا۔ اس لڑکی کا خط اور دوست کا چکر چھوڑ دیجئے اور اپنی پڑھائی میں دھیان لگایئے اسی پر آپ کے مستقبل کا دارومدار ہے۔''

میرے دوست زین نے مجھے مینا کے بارے میں بتایا:

''مینا! دسویں پاس ہے اور شیٹی کے ہوٹل میں کام کرنے والے راموٹیبل والے کے ساتھ پکچر جاتی تھی! میں نے تو یہی سنا ہے۔ کیپ اِٹ سکریٹ!''

میں سوچنے لگا۔ کیا مینا واقعی ایک بگڑی ہوئی لڑکی ہے۔ بھابھی کا مشورہ بھی یاد آیا، میرا دھیان پڑھائی سے اُچٹ گیا۔

امتحان کو ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ ایک جمعرات کی صبح میں بمبئی اسپتال پہنچ گیا۔ سائیکیٹرِک ڈپارٹمنٹ کے باہر بینچ پر مینا اکیلی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی میں بھی بینچ پر بیٹھ گیا۔

''نوکرانی ایکسرے ڈپارٹمنٹ گئی ہے۔'' وہ بولی۔

میرا جی چاہا مینا کو لے کر کہیں بھی نکل جاؤں۔ لیکن کہاں؟ آج دنیا کہاں سے کہاں جا رہی ہے اور میں بے کار ہوں۔ تھرڈ ڈویژن میں بی۔اے۔ کیا ہے۔ میرا بھی مستقبل سیاہ ہے۔ وکالت پاس کر کے بھی عدالتوں کے دروازوں پر کھڑے رہ کر دوسرے وکیلوں کی طرح، موکلوں کے آگے پیچھے ہی دوڑنا پڑے گا؟

''کیسی ہو تم؟''

''.........''

مجھے بھابھی کا مشورہ یاد آیا، میں شش و پنج میں تھا۔

''مینا! مجھے تم سے ہمدردی ہے، مگر میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ میں زنجیروں میں بندھا ہوں۔''

مینا کی مسکراہٹ غائب ہوگئی اور چہرہ کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

میں اٹھ کر جانے لگا تو مجھے محسوس ہوا، مینا کہہ رہی ہے۔ بزدل! ڈرپوک!!

امتحان ختم ہوئے۔ جیسے ویسے چھٹی ملی تو ایک صبح مینا کی بلڈنگ کے نیچے بھیڑ دیکھ کر بھابھی نے مجھے جگایا۔ لوگ کھڑکیوں سے جھانک رہے تھے۔

''جاؤ نیچے کیا ہوا دیکھ کر آؤ''، بھابھی نے مجھ سے کہا۔

میں کسی اخباری رپورٹر کی طرح نائٹ سوٹ ہی میں بلڈنگ کے نیچے چلا گیا۔

پتہ چلا کہ مینا نام کی لڑکی نے گیلری سے چھلانگ لگا دی ہے۔'' کیوں گری؟ شاید پاگل تھی؟ عشق میں دھوکا کھایا ہوگا؟'' لوگ چہ میگوئیاں کررہے تھے۔ میرے بدن میں کاٹو تو خون نہیں۔ مینا کو زخمی حالت میں اسپتال لے جایا جارہا تھا اور میں سوچ رہا تھا......

کیا وہ بچ جائے گی؟''

☆☆☆

پرندے :

''طوفانی ہوا سے پیڑ اُکھڑ گیا، آج بھی اس جگہ پرندے منڈلاتے ہیں!''

یک سطری کہانی - ع.ع.خ

ٹپوری

اجے اور وجے نے جب سے ہوش سنبھالا تھا انہوں نے خود کو کھیت واڑی کے علاقے ہی میں پایا تھا۔ ماں کی گود، اسکول، کھیل کا میدان ۔ ان کے لئے سب کچھ کھیت واڑی ہی تھا۔ کھیت واڑی کے بچوں کے ساتھ کرکٹ اور فٹ بال کھیلنا، ہر مذہب کے تہوار منانا، لوگوں کے دکھ سکھ میں شامل ہونا ان کا معمول تھا۔ وہ یتیم تھے انہیں پال پوس کر یہیں کے بزرگوں نے بڑا کیا۔ جو سنسکار انہیں ملے وہ یہیں سے ملے ۔ اب ان کے ساتھی نوکریوں اور کاروبار میں مصروف تھے۔ لیکن اجے اور وجے ٹپوری کے ٹپوری ہی رہے۔ وہ اسکول میں بھی چھٹی جماعت سے زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ لوگوں نے انہیں دھتکارا بھی اور پیار بھی کیا۔

اجے اور وجے جب موڈ میں ہوتے اور بے کار ہوتے تو کسی فلم کا یہ گیت سنگت میں ضرور گاتے۔

دنیا میں رہنا ہے تو کام کر پیارے
ہاتھ جوڑ سب کو سلام کر پیارے
ورنہ یہ دنیا جینے نہیں دے گی
کھانے نہیں دے گی پینے نہیں دے گی

کھیت واڑی کا علاقہ سیاسی سرگرمیوں کے لئے مشہور تھا۔ شہر میں ویسے بھی سیاسی آندولنوں کی کمی نہ تھی۔ کھیت واڑی تو آندولنوں کا گڑھ تھا۔ کبھی بے روزگاروں کے لئے آندولن ہو رہے ہیں، کبھی طوائفوں کے مطالبات کو لے کر مورچہ نکالا جا رہا ہے۔ بیرون شہر سے آندولن میں شامل ہونے کے لئے جو لوگ آتے ان کا سامان پوٹلیوں میں بندھا ہوتا، آندولن تو بہانہ ہوتا۔ اصل مقصد تو ممبئی دیکھنا ہوتا۔ لوگ آندولن کے نام دیہاتوں سے نکلتے اور بنا ٹکٹ ٹرین میں سوار ہو کر، سیاسی پارٹیوں سے پیسے لے کر ممبئی شہر میں آدھمکتے، آندولن میں شامل ہوتے نعرے لگاتے اور آندولن کی شوبھا بڑھاتے۔ مورچے میں جتنے زیادہ لوگ ہوتے مورچہ اتنا ہی کامیاب قرار پاتا۔ ہر پارٹی شکتی پردرشن کے لئے مورچہ نکالتی۔ مورچے کو پولس منترالیہ سے کافی دور آزاد میدان میں روک لیتی اور کچھ لوگ وزیر اعلیٰ کو میمورنڈم دینے کے لئے منترالیہ چلے جاتے۔ زیادہ تر لوگوں کے لئے مورچہ موج مستی کا ذریعہ تھا۔ مورچہ کھیلنے کھانے اودھم مچانے نعرے لگانے اور سیر کرنے کی چیز تھی۔ مورچے والوں کو وڑا پاؤ اور چائے دی جاتی۔ مورچے والے سمندر کنارے ٹہلنے جاتے اور فلک بوس عمارتوں کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔

مظاہرے کے بعد مورچے والے مختلف مقامات پر خریداری اور تفریح کرتے نظر آتے۔ آندولن کس مقصد کے لئے ہو رہا ہے؟ مورچہ کس لئے نکالا جا رہا ہے؟ کسی کو ان سوالوں سے کوئی غرض نہ تھی۔ ان کا کام نعرے لگانا اور پارٹی کا کام اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا تھا۔

اجے اور وجے کام کے پیچھے نہیں دوڑتے تھے بلکہ اب کام ان کے پیچھے چلا آتا تھا۔ اجے اور وجے ہر سیاسی پارٹی کا کام کرتے تھے۔ انہیں پیسوں سے مطلب تھا۔ پوسٹر چپکانا، بینر لگانا، لوگوں کو اکٹھا کرنا، چائے پلانا، نعرے لگانا، جھنڈے اٹھانا۔ جیسے ہی مورچے کی تیاریاں شروع ہوتیں، اجے وجے کا کھانا وانا، چائے پانی، بیڑی کاڑی شروع ہو جاتی، ورنہ عام دنوں میں وہ گلی کے نکڑ پر چرس پیتے اور نشے میں دھت رہتے تھے۔

کھیت واڑی میں مارواڑیوں، گجراتیوں، مہاراشٹرینوں، مسلمانوں اور پارسیوں کی ملی جلی آبادی تھی۔ گنیش اتسو ہو یا جے سنتوشی ماں کا تہوار، عید ہو یا محرم، نوروز ہو یا پٹیٹی، اجے وجے صبح سے شام تک مصروف رہتے۔ اسلم سیٹھ کے لئے ٹیکسی لانا، پیستن جی کے گھر کا الکٹرک بل یا ٹیلی فون بل بھرنا، مورے صاحب کے بچے کو اسکول سے لانا یا لے جانا وہ ہر طرح کا کام کرتے تھے۔ لوگوں میں

ان کی ڈیمانڈ تھی اور بہت !!

اجے اور وجے کی ضروریاتِ زندگی مختصر تھیں۔ دو وقت کا کھانا، بیڑی کاڑی اور چرس، شراب، کبھی کبھار کپڑے! روزانہ کا خرچ وہ سیاسی پارٹیوں کے چھٹ بھیے نیتاؤں سے نکال لیتے تھے۔ کپڑے تو اور دوسرے بڑے اخراجات کے لئے چھوٹی موٹی چوریاں کر لیتے، جیسے رات میں کار یا ٹیمپو کے ٹائر اور دوسرے پارٹس چرانا اور چور بازار میں اونے پونے داموں بیچ دینا۔ کاروں میں لگے ٹیپ ریکارڈر، ایف ایم چرانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ بڑی ضروریات پوری کرنے کے لئے انہیں کبھی پک پاکیٹنگ بھی کرنا پڑتی تھی۔ چوریوں کے جرم میں وہ جیل بھی جاتے تھے لیکن چھٹ بھیے نیتا انہیں زیادہ دن جیل میں نہیں رہنے دیتے تھے اور کسی طرح چھڑا لیا کرتے تھے۔ اجے وجے کام کے آدمی جو تھے! الیکشن کے وقت تو ان کی بہت ہی ضرورت پڑتی تھی۔ اجے وجے اسپتال میں جا کر پیسوں کی خاطر خون بھی دے آتے تھے۔ کئی لوگوں نے انہیں اسمگلنگ کے کام پر لگانا چاہا مگر انہوں نے یہ کام کبھی نہیں کیا۔ کسی کو بلاوجہ مارنے پیٹنے یا دھمکی دینے کے لئے انہیں سپاری دینے کی کوشش کی گئی لیکن اس کام سے بھی انہوں نے ہمیشہ انکار کیا۔ صرف ایک بار، جب گپتا جی کے لڑکے نے اپنی کار سے گول پیٹھا پر ایکسیڈنٹ کر دیا تھا اور اسے جیل ہو گئی تھی، اس کی جگہ اجے نے جیل کاٹی تھی۔ یہ سب بزرگوں کے دیئے سنسکاروں کا ہی نتیجہ تھا جو ان میں اس درجہ کی شرافت موجود تھی۔ لیکن اس کے باوجود لوگ انہیں ٹپوری ہی کہتے تھے!

ایک دن :

اجے اور وجے کھیت واڑی کے سیاسی دفتروں کے آس پاس منڈلا رہے تھے کہ کشن بھیا نے ان سے کہا کہ کل پارٹی کا مورچہ ہے اور آج سے تیاریاں شروع کر دو۔ بس پھر کیا تھا اجے وجے کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ مورچے کے لئے لوگوں کو جمع کرنے میں مصروف ہو گئے۔ کھیت واڑی کے اور آس پاس کے علاقوں میں ایسے لوگوں کے ٹھکانے اجے وجے کو معلوم تھے جو پیسے لے کر مورچوں کی شوبھا بڑھاتے اور نعرے لگاتے تھے۔ انہوں نے علاقے بھر میں سینکڑوں لوگوں کو پروفیشنل واویلا مچانے والے بنا دیا تھا۔

دونوں رات بھر بینر باندھنے اور پوسٹر چپکانے میں لگے رہے۔ رات ہی میں گیٹ بھی بنائے۔ کام کرتے ہوئے چرس کا دم بھی لگاتے رہے اور نوٹانک بھی چڑھا لی۔

وجے کے مطابق "یہ سب تو ہمارا پیٹرول ہے! اس کے بغیر گاڑی کیسے چلے گی۔"

مورچہ نکلا۔ مورچہ کھیت واڑی سے پرارتھنا سماج، گرگام اور دھوبی تالاب ہوتے ہوئے آزاد میدان جارہا تھا جہاں پارٹی کا جلسہ ہونے والا تھا اور ممبئی کولکاتا، دہلی کے بڑے نیتا تقریر کرنے آنے والے تھے۔

مورچہ سڑک پر آیا تو پتہ چلا کہ بڑا ہجوم ہے۔ سڑک کے دونوں جانب عمارتوں کی گیلریوں اور کھڑکیوں میں عورتیں، مرد اور بچے کھڑے مورچے کو دیکھ رہے تھے۔ ٹریفک رک گیا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر سے نعرے بلند ہورہے تھے۔ پرارتھنا سماج پہنچنے تک تو مورچہ اپنے شباب پر پہنچ چکا تھا۔ چاروں طرف ٹریفک پولس سیٹیاں بجا بجا کر رکی ہوئی موٹر گاڑیوں کو تنگ راستوں سے نکال رہی تھی۔ ٹرکوں پر بونگو اور بینجو بج رہے تھے اور فضا پٹاخوں اور نعروں سے گونج رہی تھی۔

ایک شخص نے اجے سے پوچھا:

"مورچہ کس پارٹی کا ہے؟"

"پتہ نہیں۔"

"کس مقصد سے نکالا گیا ہے؟"

"پتہ نہیں۔"

مورچے میں شامل بہت سے لوگ سڑک پر جہاں "شوچالیے" (رفع حاجت کی جگہ) دیکھتے، مورچہ چھوڑ کر اس میں داخل ہوجاتے اور فراغت کے بعد پھر دوڑ کر مورچے کو پکڑ لیتے۔ کچھ لوگ سڑک کے کنارے واقع چائے کی دکانوں پر چلے جاتے اور چائے سُڑک کر پھر مورچے میں شامل ہوجاتے۔

اجے وجے کو قریب سے ایک لمبا تڑنگا شخص گزرتا نظر آیا جس کی صدری کی جیب کافی پھولی ہوئی تھی۔ اجے کی تجربہ کار نگاہوں نے اسے دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ موٹی اسامی ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا۔ چاروں طرف نعرے لگ رہے تھے۔ انہوں نے ہاتھوں میں اٹھایا ہوا پارٹی کا بینر ساتھ چلنے والے دونو جوانوں کو پکڑا دیا اور آہستہ سے مورچے سے باہر نکل گئے۔

رات ہوچکی تھی۔

آزاد میدان میں وہ دونوں اس پنڈال کے قریب گھاس پر بیٹھے وہسکی پی رہے تھے جس پر

سے ایک گھنٹہ پہلے لیڈروں نے بھاشن دیئے تھے اور ہزاروں کے مجمع نے ان کو دل جمعی سے سنا تھا۔

اجے نے چکن ٹنگا کا مسالے دار لقمہ چباتے ہوئے کہا:

"آئی لا! دیکھ تو وجے اپُن کا ممبئی اندھیرے میں کتنا مست دکھ رے لا ہے۔"

وجے نشیلے لہجے میں بولا:

"یہ سب سالا سیٹھ لوگ کا کمال ہے۔ تو خالی پیلی ٹُنس مت دلا، دال گلاس میں......"

☆☆☆

اعزاز :

"ماں نے دہشت گرد بیٹے کا قتل کر دیا اور سرکار کا اعزاز ٹھکرا دیا!"

یک سطری کہانی - ع.ع.خ

دیوداس-کل اور آج

ایک شام:

ممبئی کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں بیڈ نمبر ۴۵۵ رکا مریض جس کی بائیں ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا ہوا ہے۔ لیٹے لیٹے شرت چندر کا ناول 'دیوداس' پڑھ رہا ہے، جس میں دیوداس کا آخری وقت قریب تھا اور وعدے کے مطابق وہ پارو سے ملنے گاؤں پہنچ رہا تھا۔

......دیوداس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ آج کئی دنوں سے اسے ماں کی یاد آ رہی ہے۔ اسپتال میں پڑے پڑے وہ یہی سوچتا رہتا ہے کہ اس سنسار میں اس کے بھی رشتے دار ہیں پھر بھی کوئی نہیں۔ ماں ہے۔ بڑا بھائی ہے۔ پاروتی ہے۔ چندر مکھی ہے۔ سبھی ہیں اس کے پر، وہ کسی کا نہیں............

"نمستے صاب!" بوڑھے وارڈ بوائے نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے نمسکار کیا۔

"کیا بات ہے؟" بیڈ نمبر ۴۵۵ کے مریض نے ورق کا کونا موڑ کر ناول بند کر دیا۔

"آج ہمارا چھٹی ہے صاب!"

"اچھا! تو؟"

"دو روپیہ مانگتا صاب۔ صرف دو روپیہ۔" وارڈ بوائے نے عاجزی سے جواب دیا:

"امارے سر کا اندر بہت جور کا درد ہوتا صاب! کل سے دارو نہیں پیا۔ کسم سے ایک گھونٹ بھی نہیں

پیا۔‘‘

’’ہم رشوت نہیں دیتے‘‘ بیڈ نمبر ۴۵۵ کے مریض نے کہا۔’’ جاؤ ڈاکٹر کو بولو۔‘‘

وارڈ بوائے نے کڑوا سا منہ بنایا اور غصے سے اسے گھورتا ہوا باہر نکل گیا۔

یہ بوڑھا ایک دن شراب نہیں پئے گا تو مر تو نہیں جائے گا۔ مریض سوچتا ہے۔

پیسے دے کر وہ کیوں اس کی عادت بگاڑے؟ اس نے پیسے نہیں دیئے تو ٹھیک ہی کیا۔ لیکن لیکن کیا اسے اسپتال کے منتظم سے اس کی شکایت کرنی چاہئے؟ یہی سوچتے سوچتے اس نے پھر ناول اٹھایا اور ورق گردانی کرنے لگا۔

..........دیوداس کو پتہ بھی نہ چلا کہ رات کیسے بیتی، وہ بالکل بے سدھ اور بے ہوش پڑا رہا۔ صبح ہوش آیا، تو گاڑی بان سے پوچھا:

’’بھائی گاڑی بان کتنا فاصلہ باقی ہے؟ کیا یہ راستہ کبھی ختم ہی نہ ہوگا؟‘‘

’’بس سمجھو ہو ہی گیا صاب!‘‘ گاڑی بان نے جواب دیا۔’’صرف چھ کوس باقی ہے۔ دو تین گھنٹوں میں پہنچ جائیں گے۔‘‘

’’ذرا جلدی چلو بھیا!‘‘ دیوداس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔’’اب وقت نہیں ہے‘‘......

.........نرس کمرے میں داخل ہوتی ہے۔

’’ہلو! مسٹر ۴۵۵، ہاؤ آر یو؟‘‘

’’فائین!‘‘ مریض نے اسے مسکرا کر دیکھا اور ناول بند کر دیا۔

’’کیا پڑھ رہے ہو؟‘‘ نرس کے لہجے میں اتراہٹ ہے۔

’’اوہ! مائی گاڈ! دیوداس! ارے! تم کیسا آدمی ہے، ہوسپیٹل میں ’دیوداس‘ پڑھتا ہے! کوئی کامیڈی ناول نئیں تو رومانٹک ناول پڑھنے کو مانگتا مین۔ ایسا ٹریجک ناول تم کیوں پڑھتا؟‘‘

مریض مسکرا کر نرس کو دیکھ رہا ہے۔ خوبصورت جوان بدن کی قربت اسے اچھی لگ رہی ہے۔

نرس نے مریض کے بغل میں تھرمامیٹر لگا دیا۔ دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے مریض کی کلائی پکڑ لی اور گھڑی دیکھنے لگی۔ مریض کے دل کی رفتار ممکن ہے کچھ بڑھی ہو۔ مگر اس کے چہرے سے پتہ نہیں چلتا۔ سوکھے ہوئے گال ویسے ہی رہتے ہیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار مریض کی نظر نرس کے گریبان سے لٹکتے کراس کی طرف چلی جاتی ہے۔ گلابی جلد پر سنہرا کراس کتنا خوبصورت لگ رہا ہے۔

’’کیا دیکھتا ہے مین؟‘‘ نرس شوخی سے پوچھتی ہے۔

......وہ کچھ جھینپ سا جاتا ہے۔

"یہ کراس بہت خوبصورت ہے۔"

"تم کو اچھا لگتا ہے۔" نرس مریض پر اور جھک جاتی ہے۔

ابھرا ہوا سینہ کسی گھٹیا سینٹ سے مہک رہا ہے۔ مگر اسے تو صرف پکار سنائی دیتی ہے۔ پتہ نہیں کس کی۔ چہرہ قریب ہے اسی لئے اس کے گلابی ہونٹ اور ان پر مچلتے ہوئے سنہرے روئیں اسے صاف نظر آ رہے ہیں۔

"آج کچھ خاص بات ہے؟" اس نے نرس سے آہستہ سے پوچھا۔

"شٹ اپ" وہ بے ساختہ شرما کر بولی۔ پھر مسکرائی۔ "آج ہم اپنا بوائے فرینڈ کے ساتھ پکچر جانے والا ہے۔"

"ویری گڈ! تمہارا بوائے فرینڈ کیا کرتا ہے؟"

"وہ ایک کمپیوٹر آفس میں مینجر ہے۔ ہم سے بہت پیار کرتا ہے۔"

"گاڈ! تمہارے پیار کو سلامت رکھے۔ بہت کم لوگوں کا پیار کامیاب ہوتا ہے۔"

"کیا تم بھی کسی سے پیار کرتا ہے مین۔"

"کرتا تھا، اب اس کے زخم لے کر جی رہا ہوں!"

"تو اب ہم کو معلوم پڑا تم ٹریجک ناول کیوں پڑھتا ہے۔"

نرس نے تھرما میٹر بغل سے نکال کر دیکھا اور چارٹ پر کچھ لکھنے لگی۔

"میرا دل ایسے لگتا ہے جیسے پھٹ جائے گا۔"

.........نرس چمکارتی ہے۔

"آج تو تم نارمل سے بھی کم ہے!"

"واقعی........." مریض گھبرا گیا۔

.........نرس کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"نارمل ہے!" ....وہ تھرما میٹر بکس میں رکھتے ہوئے کہتی ہے۔

.........گاڑی بان نے پاس کے ایک تالاب سے اسے تھوڑا سا پانی لا دیا۔ دیوداس کی ناک سے بار بار خون ٹپک پڑتا۔ اس نے ناک بند کر لی مگر منہ خون کے ذائقہ سے کڑوا ہو گیا۔ سانس رکنے لگا۔

''بھائی گاڑی والے'' دیوداس نے پوچھا، ''ابھی کتنا راستہ باقی ہے؟''

''بس دو کوس اور ہوگا۔''

''ہے بھگوان!'' دیوداس نے سر اٹھا کر راستے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ''درد اب اس کی برداشت سے............''

مریض نے دیکھا کہ وہی بوڑھا وارڈ بوائے نشے میں چور اس کے سامنے کھڑا ہے۔

''صاب کا بچہ!..........'' نشے سے اس کی زبان لڑکھڑا رہی ہے۔ ''تم نے اَم کو پیسہ نہیں دیا نا؟......سالا اَم کو کونسا پھرک پڑ گیا......اَم ڈیوٹی روم سے اسپرٹ نکال کر پی لیا......اَم کو کیا پھرک پڑا......بولو......سالا! تم گنگا رام کو نہیں جانتا..........ام سب کا بھید جانتا..........یہ سالا! ڈاکٹر لوگ......یہ نرس لوگ......اَم کو سب معلوم ہے......کس کا کس کا ساتھ لفڑا چلتا ہے..........کمپلین کرے گا نا امارا کمپلین کرے گا..........تو کرو کمپلین..........اَم کس سے نہیں ڈرتا..........گنگا رام گھبرنے والا آدمی نہیں..........اَم پرمانٹ ہے..........پرمانٹ......کیا سمجھا..........گنگا رام کسی سے نہیں گھبرتا..........''

بوڑھا وارڈ بوائے کمرے سے باہر نکل گیا۔

مریض نے ناول دیوداس اٹھا کر تپائی پر رکھا اور کھڑکی کے باہر درختوں پر بیٹھے کوؤں کو دیکھنے لگا جو اپنی کائیں کائیں سے سارا ماحول مکدر کیے دے رہے ہیں!

☆☆☆

کھاٹ :

''تپ دق زدہ شوہر کے مرتے ہی بیوی نے اُس کی کھاٹ جلا دی!''

یک سطری کہانی - ع.ع.خ

شہنشاہ

ممبئی میں افسرِ اعلیٰ کے بنگلے پر وہ کبھی نہیں گیا تھا۔ پہلے آفس گیا مگر وہ وہاں نہیں ملے۔ کلرک نے جو اس کے تعلق کا تھا کہا:

''اپنے کام کے لئے صاحب سے گھر جا کر ملنا چاہئے، یہاں آفس میں ملنا تو بے کار ہے۔ کوئی نہ کوئی جان پہچان والا آ جاتا ہے۔ آفس کے دوسرے افسران اور کارکن۔ لوگ فائل اور ریکارڈ دیکھنے ملنے اور سلام مارنے آتے ہی رہتے ہیں۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ تم ان سے گھر پر ہی ملو۔ ان کا موڈ گھر میں عموماً ٹھیک رہتا ہے۔''

آفس سے زیادہ دور تو نہیں مگر شہر کے مہنگے علاقے مالابار ہل میں ان کا بنگلہ تھا۔ وہ ٹیکسی کے ذریعے وہاں پہنچا۔ دل ہی دل میں سوچا کہ کام ہو جانا چاہئے۔ وہ کب سے پریشان ہے۔ شوہر وہاں بیوی یہاں۔ یہ کیسا بن باس ہے؟ اس امید پر کہ ٹرانسفر ہوگا، کلرک کا مشورہ اس نے مان لیا تھا۔ بنگلے کے چاروں طرف کیاریاں اور پودے لگے تھے۔ برآمدے سے لگا ہوا ٹن کا ایک شیڈ تھا جہاں جیپ کھڑی تھی۔ واچ مین اور ڈرائیور جیپ کے پاس بیٹھے تھے۔ دونوں کے یونیفارم اتنے مختلف نہیں تھے کہ وہ لوگ الگ الگ نظر آئیں مگر پتہ نہیں اس نے کیوں کر انہیں پہچان لیا تھا، حالانکہ وہ پہلی بار یہاں آیا تھا۔ اسے دیکھ کر ڈرائیور بولا:

''کیوں صاحب کدھر؟''

''بس ایسے ہی۔ ذرا بڑے صاحب سے ملنے آیا ہوں۔''

''بڑے صاحب سے! اچھا! اچھا! ابھی تو بڑے صاحب برش کر رہے ہیں۔''

''برش کر رہے ہیں! صاحب ابھی ابھی سو کر اٹھے ہیں؟ میں ان سے ملنے آفس گیا تھا مگر وہاں نہیں تھے۔ ساڑھے دس بج گئے ہیں؟''

یہاں آنے کا اس کا یہ پہلا موقع تھا، بلکہ کسی بھی افسرِ اعلیٰ کے بنگلے پر جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔

وہ بار بار چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے تعجب ہوا۔ وہاں ایک کتا بھی نہ تھا!

''صاحب! آپ کہاں سے آئے ہیں؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

اس نے تعلقے کا نام لیا۔

''اچھا صاحب! کیا کام ہے؟'' واچ مین نے پوچھا۔

''تم کو بھلا وہ کام کیسے بتائیں گے؟ وہ تو بڑے صاحب ہی سے بات کریں گے نا۔'' ڈرائیور بولا۔

'ہاں تو صاحب! آپ کو ان سے ملنا ہے۔ ٹھیک ہے۔ جب وہ تمام ضروریات سے فارغ ہو جائیں گے تب میں جا کر خبر دوں گا، پھر وہ آپ کو بلائیں گے۔'' واچ مین نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ بولا۔

وہ خاموش کھڑا رہا۔

ڈرائیور اور واچ مین بیڑی پھونک رہے تھے۔

''ذرا جا کر تو دیکھو، کیا کر رہے ہیں صاحب!'' اس نے پوچھا۔

واچ مین گیا اور لوٹا تو بولا:

''نہا رہے ہیں۔''

''نہانے کے بعد کیا کریں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہانے کے بعد صاحب بھوجن کریں گے، پھر آفس کے لئے نکلیں گے۔'' ڈرائیور بولا۔

'' اچھا! اچھا! دراصل میں پہلی بار یہاں آیا ہوں نا اس لئے مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ میں نے تو یہ سمجھا تھا صاحب نکل گئے ہوں گے اس لئے میں آفس گیا تھا۔'' وہ بولا۔

دونوں بیڑی پھونکتے رہے۔

''بیٹھئے نا صاحب! آپ کھڑے کیوں ہیں؟'' ڈرائیور نے کہا۔

مگر آس پاس کوئی کرسی نہ تھی۔

''صاحب! ہمارے ساتھ نیچے ہی بیٹھ جائیے نا ہری ہری گھاس پر۔'' واچ مین بولا۔

''ارے واہ! تم بھی کیا بات کرتے ہو، صاحب! کیا ہمارے ساتھ نیچے بیٹھیں گے؟ ایک کرسی لاؤ اندر سے۔'' ڈرائیور بولا۔

''نہیں نہیں میں بیٹھ جاتا ہوں۔'' کہتے ہوئے وہ بیٹھ گیا۔

''ارے رامو! ایک مرتبہ ایک بدیسی آیا تھا۔ معلوم نہیں اسے کیا کام تھا، بولا صاحب سے ملا دو۔ صاحب اس وقت ٹوائلٹ (Toilet) میں تھے میں نے کہا بیٹھو۔ تھوڑی دیر تو وہ پالتھی مار کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے اسے بیڑی دی، اس نے بیڑی پی پھر اس نے اپنی جیب سے فارین سگریٹ کا پیکٹ نکالا، ایک سگریٹ مجھے بھی دی، پھر صاحب نے اسے بلایا۔ جب وہ لوٹا تو میں نے پوچھا، کیوں صاحب! کام ہو گیا؟ تو وہ بولا 'ہاں! ہاں!' اور دس روپئے کا نوٹ نکال کر بخشش دیا۔ اپن بھی خوش۔ وہ بھی خوش!''

''فاریز ایسے ہی ہوتے ہیں بھئی، وہ اونچ نیچ نہیں دیکھتے۔ ورنہ اپنے ملک کے صاحب لوگ اتنی بڑی بڑی کرسیوں پر جا کر بیٹھ جاتے ہیں، ان کے میس الگ، گھر الگ، ان کے ٹوائلٹ الگ، کھیلنے کا میدان الگ، سب الگ الگ!'' ڈرائیور نے کہا۔

''مگر میں کہتا ہوں رامو خون تو سب کا ایک ہے!''

واچ مین بولا:

''ذرا دیکھو تو صاحب کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے دبی زبان سے ملتجی ہو کر کہا۔

''آپ کہہ رہے ہیں تو میں اندر دیکھ کے آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر واچ مین اندر چلا گیا۔

''شکر ہے وہ بھوجن کرنے بیٹھے ہیں۔'' واچ مین نے آ کر بتایا۔

''کتنی دیر لگے گی؟'' اس نے پوچھا اور کھڑا ہو گیا۔

''اب ہم کیا بتائیں؟ وہ صاحب ہیں، چاہے جب تک کھائیں...... چاہے صبح سے شام تک کھائیں......'' واچ مین بولا۔

وہ چپ ہو گیا۔

''صاحب بیٹھئے نا کب تک کھڑے رہیں گے؟'' ڈرائیور بولا۔

وہ پھر بیٹھ گیا۔

واچ مین نے اسے بیڑی دی۔ اس نے نہیں لی۔ بہت دیر تک وہ دونوں بیڑی کا دھواں اس

کے منہ پر چھوڑتے رہے!

اسے یاد آنے لگا۔

ایک ہفتے بعد جیسے کسی اور دنیا سے نکل کر وہ گھر آتا ہے۔ بیوی چائے بناتی ہے۔ وہ چائے اس طرح سپ کرتا ہے جیسے برسوں بعد ملی ہو۔ پھر وہ کپڑے تبدیل کر کے آرام کرسی میں دھنس جاتا ہے۔ وہ ڈاک سے متعلق پوچھتا ہے۔ بیوی کھانا لگاتی ہے۔

کھانا لگاتے ہوئے بیوی چاہے گی کہ وہ کچھ باتے کرے۔ کم سے کم کھانے کے بارے میں ہی کچھ بولے مگر جیسے کہ اس کی عادت ہے۔ نہ اسے کھانے کے دوران بولنا پسند ہے نہ کسی کا بولنا اسے اچھا لگتا ہے۔

وہ چاہتا ہے کہ وہ باپ بنے مگر بیوی کہتی ہے جب تک ٹرانسفر نہیں ہوتا تو وہ بچے کے جھمیلے میں نہیں پڑنا چاہتی۔ لیکن ایک نفسیاتی کانٹا اکثر اس کے دل میں چبھتا رہتا ہے کہ کہیں کوئی اور اس کی بیوی کے قریب..........!

وہ تھکا ہارا کروٹ بدل کر سو جاتا ہے!

اس نے بچپن میں ایک کہانی سنی تھی۔ کوے اور مینا کی کہانی۔ خوب بارش ہو رہی تھی اور کوے کا نمک کا گھر بہہ گیا تھا، تب وہ پناہ لینے مینا کے موم کے گھر میں آیا اور بولا:

''مجھے پناہ دے۔''

مگر مینا نے اس وقت تک دروازہ نہیں کھولا جب تک اپنے سارے کام نہیں کر لیئے، بے چارہ کوا بارش میں باہر کھڑا بھیگتا رہا۔

وہ موم کے گھر والے بڑے صاحب کے یہاں آنا نہیں چاہتا تھا مگر مجبوری تھی۔ اس کی بیوی یہاں کے ایک کالج میں لکچرار تھی اور وہ اپنے قصبے کے کوآپریٹیو سوسائٹیز کا منیجر تھا۔ دونوں اتوار کو ملا کرتے۔ وہ بس سے یہاں آجاتا تھا۔ مگر وہ چاہتا تھا کہ روز بیوی سے ملا کرے۔ اسے لگتا کہ دنیا میں اس کی بیوی جیسی کسی کی بیوی نہیں، اور وہ اسے اکیلی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ بیوی بھی اکثر کہتی:

''کیوں نہیں یہاں ٹرانسفر کروا لیتے؟''

"مشکل ہے!"

"تو پھر دو سال کسی نہ کسی طرح نکال لو۔"

"دو سال-اف!......دو سال یعنی دو صدیاں!!"

"تم دیکھ رہے ہو ہمارے اخراجات کتنے بڑھ گئے ہیں۔ہم یہاں ایک جگہ رہیں گے تو خرچ بھی کم ہوگا۔"

"یہ بات تو ٹھیک ہے۔"

"سنو، ہماری ایک ساتھی لکچرار کے شوہر کا بھی ایسا ہی کیس تھا، وہ انجینئر تھا اور اس نے افسرِ اعلیٰ سے بات کی کام پھٹا پھٹ ہو گیا۔تم ایسا کیوں نہیں کرتے؟"

وہ ان بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کی چاپلوسی کرے۔مگر نوکری میں یہ نوبت بھی آ گئی۔ بیوی نے بہت اصرار کیا تو وہ تیار ہو گیا۔پھر کلرک نے بھی اس سے کہا تو وہ انکار نہ کر سکا۔صبح ہی صبح وہ اپنے قصبے سے نکلا اور سیدھے آفس گیا اور اب صاحب کے بنگلے پر تھا۔ بیوی صبح کالج چلی جاتی تھی اس لئے وہ اس سے بھی ملنے نہیں گیا تھا۔اس نے سوچا تھا دوپہر تک بیوی بھی آ جائے گی تب آرام سے گھر جاؤں گا پہلے یہ کام تو نپٹا لوں!

وہ بیٹھا رہا۔پھر اس نے گزارش کی:

"ذرا جا کر دیکھو تو، شاید اب صاحب فارغ ہو چکے ہوں اور شاید تمہیں یہ کہنے کا موقع مل جائے کہ باہر میں کھڑا ہوں اور ملنا چاہتا ہوں۔"

واچ مین اٹھا، اندر گیا اور لوٹ کر بولا:

"ارے تعجب کی بات ہے! صاحب تو سنگیت سن رہے ہیں۔"

"سنگیت سن رہے ہیں!" وہ بولا، "یہ بھی کوئی سنگیت سننے کا وقت ہے؟"

"ارے صاحب! آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔وہ تو افسرِ اعلیٰ ہیں وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں!" ڈرائیور بولا۔

"وہ سنگیت کیسے سن سکتے ہیں؟ میں یہاں کھڑا ہوں، ان سے ملنا چاہتا ہوں" وہ ذرا تیز آواز میں بولا۔

"صاحب ذرا آہستہ بولئے، میرے حساب سے تو صاحب کو اس وقت ڈریس بدل کر آفس جانا چاہئے۔" واچ مین نے کہا۔

''ارے! کیا بات کرتے ہو؟ وہ تو افسرِ اعلیٰ ہیں اپنی مرضی سے کچھ بھی کر سکتے ہیں!''
ڈرائیور بولا۔

''مگر میں یہاں کھڑا ہوں!'' وہ چیخ پڑا۔

''کون کہاں کھڑا ہے افسرِ اعلیٰ اچھی طرح جانتے ہیں۔'' واچ مین بولا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ اچانک صاحب نمودار ہوئے۔

آنکھوں پر سنہری عینک، انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں، کلائی میں سنہری راڈو گھڑی، سوٹیڈ بوٹیڈ ٹائی باندھے۔ انہیں دیکھ کر ڈرائیور اور واچ مین اپنی اپنی بیڑیاں پھینک کر کھڑے ہو گئے اور ان کے ساتھ ہی وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

وہ قریب گیا۔ پرنام کیا۔

''کیا بات ہے؟'' صاحب نے پوچھا۔

''قصبے سے آیا ہوں وہاں کوآپریٹو سوسائٹیز کا منیجر ہوں۔''

''منیجر کا نام بھی ہوتا ہے؟''

''سر! میرا نام شہنشاہ ہے۔'' ان کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اونہہ! کیا کام ہے؟''

''ٹرانسفر کروانا ہے، ممبئی میں۔ بات یہ ہے کہ......'' وہ دھیرے دھیرے بولا۔

''جو کہنا ہے زور سے کہیئے؟''

''سر! ٹرانسفر کے لئے آیا ہوں۔'' وہ زور سے بولا۔

''ہاں! میں نے سن لیا۔ کیوں چاہئے ٹرانسفر؟''

''میری بیوی یہاں لکچرار ہے، میں وہاں اکیلا ہوں۔''

''اچھا تو گرہست جیون بتانا چاہتے ہیں؟''

''جی ہاں!'' وہ جھینپ گیا۔

''کونسی پوسٹ پر ہو۔ منیجر؟'' طنزیہ لہجہ میں پوچھا، ''میں اگلے مہینے آرہا ہوں دورے پر۔ کام میں Progress چاہئے Performance چاہئے۔''

''یس سر!''

''ٹرانسفر کراتے رہو گے تو پرفارمینس کیسے دکھاؤ گے؟ تم ابھی جوان ہو! تم سے ہمیں بڑی

امیدیں ہیں، تم شہر میں آنا چاہتے ہو، ہمت مت ہارو!''

''نہیں سر! ہمت نہیں ہاریں گے۔''

''میں دورے پر آرہا ہوں۔'' پھر ڈرائیور سے کہا، ''رامو! گاڑی نکالو۔''

اور گاڑی کی طرف جب افسرِ اعلیٰ بڑھے تب اس نے کہا:

مگر سر! ٹرانسفر؟''

''مجھے دیر ہو رہی ہے، آفس میں آکر بات کرو۔''

جیپ اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ افسرِ اعلیٰ اس میں بیٹھے تھے۔ جیپ دھواں اڑاتی احاطے کے باہر نکل گئی۔

وہ کھڑا کا کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

''بڑے صاحب کیا بولے؟'' واچ مین نے اس سے پوچھا۔

''..............''

وہ آفس میں آیا، کلرک سے تمام باتیں بتائیں۔ کلرک معمر تھا، اس نے آفس میں اور نوکر شاہی میں کئی برس نکالے تھے۔ اسے زیادہ تجربہ تھا۔ کلرک جانتا تھا کہ وہ نوجوان ہے اس کے حوصلے بلند ہیں، کچھ کر گزرنے کی تمنا ہے۔ مگر آفس کے مزاج سے واقف نہیں۔ نئے لوگوں کے ساتھ یہی پرابلم ہوتا ہے۔

''شہنشاہ! تم کو ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا۔'' کلرک نے سمجھایا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب، ایک دم ٹرانسفر کے بارے میں۔''

''تو کیا کہنا تھا؟''

''کہنا تھا کہ ایک کام ہے میرا۔ تم نے چاپلوسی اور خوشامدانہ لہجہ نہیں اپنایا ہوگا؟''

''میں شہنشاہ ہوں! میں کیوں چاپلوسی کروں؟ میں استعفیٰ دے دوں گا۔ مگر جھکوں گا نہیں۔''

''بس یہی خرابی ہے، تم نئے لوگوں میں۔ غصہ مت کرو، ٹھنڈا پانی پی لو۔''

صاحب کیبن میں بیٹھے تھے۔ وہ جانے لگا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''صاحب! سے ملنے۔''

''ارے! ابھی جاؤ گے تو کام نہیں بنے گا اور الٹی باتیں سنو گے۔ تم ایسا کرو ابھی بیٹھو۔ کچھ دیر رک کر جاؤ۔ صاحب نے تم سے کہا تھا آفس میں آنا تو انہیں یاد ہوگا۔ تمہیں بلائیں گے تب چلے جانا۔ چلو جب تک چائے پی کر آئیں۔''

دونوں چائے پینے چلے گئے۔

واپس آئے تو صاحب سے ملنے کے لئے کیبن کے باہر لوگوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔

''اس لئے میں نے کہا تھا گھر پر جاؤ۔''

''گیا تو تھا۔''

''مگر طریقے سے نہیں گئے تھے۔''

''طریقہ کیا ہوتا ہے؟''

''ارے شہنشاہ! تم اتنے بڑے آدمی ہو، منیجر! تمہاری وہاں سوسائٹی کی دکان ہے۔ تم کچھ بھی سوغات لاتے۔ قیمتی باسمتی چاول ہی لے آتے، مرغا وغیرہ لاتے اور پیش کرتے ان کے سامنے۔ ذرا جھکتے۔ صاحب اپنے آپ نرم پڑ جاتے اور پھر تم کام کی بات کرتے۔ تو پھر کام یوں ہو جاتا! قاعدے قانون نہیں چلتے! صرف چوکس رہنا چاہئے اور جھکنا چاہئے!''

وہ سوچنے لگا۔ ایک سال اسی امید میں نکل گیا کہ ٹرانسفر ہو جائے گا اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے گا لیکن یہ موقع بھی اس نے اناڑی پن سے کھو دیا۔ مزید دو سال کا انتظار تو اس کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ اس کے سامنے اب صرف ایک ہی راستہ تھا۔ اگلے مہینے صاحب دورے پر آ رہے ہیں۔ کام میں پروگریس چاہئے! پرفارمینس چاہئے! ساتھ ہی جھکنے کی پریکٹس بھی کرنی چاہئے۔

کچھ دیر شہنشاہ انہی خیالوں میں گم کھڑا رہا۔ پھر سر جھکائے اس طرح بس اسٹینڈ کی طرف قدم بڑھانے لگا جیسے ابھی اور اسی لمحہ سے جھکنے کی پریکٹس شروع کر دی ہو۔

☆☆☆

ڈگری :

''بیٹے! بغیر ڈگری کے کوئی بھی شخص نقاد بن سکتا ہے۔''

یک سطری کہانی - ع.ع.خ

کٹا ہوا آسمان

اب ممبئی سیمنٹ، کانکریٹ، مشینوں کا جنگل نہیں رہا بلکہ اجنبی، انجان آدمیوں کا جنگل ہو گیا ہے، پہلے مس پروین باندرہ ریکلمیشن سے رکشے کے ذریعہ اپنے آفس پہنچتی تھی لیکن جب سے لوکل ٹرین میں دن دہاڑے عصمت دری کے واقعات ہونے لگے وہ بیسٹ کی ایئر کنڈیشن بس کے ذریعہ سفر کرنے لگی تھی۔

مس پروین تیکھے نقش و نگار اور دراز قد کی پر کشش دوشیزہ تھی۔ اس کے والد ہندوستانی اور والدہ فرانسیسی، کسی غیر ملکی فرم میں دونوں کا ساتھ پیار میں بدلا اور پھر دونوں نے شادی کر لی تھی۔ والدہ کی طرف سے جہاں اسے گورا رنگ ملا تھا، والد نے چمکدار آنکھیں دی تھیں۔

ممبئی کے پوش علاقے نریمن پوائنٹ میں فلک بوس عمارتوں کے بیچ ایک عمارت کی گیارہویں منزل پر اشتہاری ایجنسی ERA میں وہ کام کرتی تھی۔ آفس میں کانچ کی بڑی بڑی کھڑکیوں سے بحرِ عرب کا نظارہ روح کو مسرور کرتا تھا۔

مس پروین اپنے فولڈر اور وینیٹی بیگ کے ساتھ آفس میں داخل ہوئی اور فرم کی پارٹنر مسز مہر بھروچا کے چیمبر میں جا پہنچی۔ چیمبر نئی وضع قطع سے ڈیزائن کیا گیا تھا اور جدید ترین لوازمات سے آراستہ تھا۔ وہ ابھی چیمبر میں داخل ہی ہوئی تھی کہ مسز بھروچا بھی آ پہنچی۔ چیمبر میں دبیز اندھیرے

اجالے کا سماں تھا۔ آفس بوائے نے کافی کا مگ لاکر رکھ دیا تھا۔ مسز بھروچا نے اپنی ریوالونگ چیئر میں دھنستے ہوئے پوچھا:

''کیا سارے ڈیزائن فائنل ہو گئے ہیں؟''

پروین نے اثبات میں سر ہلایا۔ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے مسز بھروچا نے گہرے سکوت کے ساتھ پروین کے فولڈر پر نظر ڈالی اور پوچھا:

''کیا ٹاور فلیٹس کے لئے تمہارا یہی Concept ہے؟''

پروین کو اپنے پاؤں لڑکھڑاتے محسوس ہوئے۔ اس نے مسز بھروچا کے لہجے میں چھپے طنز کو بھانپ لیا تھا۔

پروین نے ان ڈیزائنوں کے پیچھے کافی محنت کی تھی۔ راتیں بے چینی سے جاگ جاگ کر گزاردی تھیں۔ اب مسز بھروچا کے کمینٹ پر کیا تاثر دیا جاسکتا ہے؟ وہ بیٹھی رہی اور سوچتی رہی۔

''دیکھو پروین! تم اس ادارے میں گذشتہ سات برسوں سے کام کر رہی ہو، لیکن افسوس سے مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ تمہیں میں اب تک سمجھ نہیں سکی ہوں۔ بعض اوقات تمہارا کام دیکھ کر لگتا ہے کہ تم کسی اور دنیا سے تعلق رکھتی ہو اور بعض اوقات تمہارا کام یونہی معمولی سا ہوتا ہے۔''

کافی کا مگ ختم کرتے ہوئے مسز بھروچا نے آگے کہا:

''ہماری ایجنسی ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ نہیں ہے۔ ہم کچھ خرچ کر رہے ہیں، کہ کچھ حاصل کریں۔ سمجھیں کہ نہیں؟''

اپنے غصے کا اظہار کرتے ہوئے مسز بھروچا فولڈر، ٹیبل پر پٹک دیا اور موبائیل اٹھا کر چیمبر سے نکل گئی۔ موبائیل کی گھنٹی بج رہی تھی۔

مس پروین حیرت کا مجسمہ بنی چند منٹوں تک وہیں کھڑی رہی پھر دھیرے سے اپنا فولڈ اٹھا کر چل دی۔ اس وقت اس پر گویا رنج وغم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا اور اسے لگا تھا جیسے وہ رو پڑے گی۔

بنگلور میں پروین کی بوڑھی ماں پروین کی چھوٹی بہن کے ساتھ رہتی تھی جو ذہنی طور پر معذور تھی اور بستر پر پڑی رہتی تھی۔ پروین نوکری کی خاطر ممبئی آئی تھی اور باندرہ میں ایک عیسائی خاندان کے ساتھ پیئنگ گیسٹ کی حیثیت سے رہتی تھی۔ گھر کی ذمہ داری پروین پر تھی۔ گریجویشن کے

دوران ایک فلمی کوریوگرافر عمران خان سے اس کی دوستی ہوگئی تھی۔ بعد میں جب پتہ چلا کہ وہ شادی شدہ ہے تو دوستی پیار میں بدلتے بدلتے رہ گئی۔ پھر کچھ ہی دنوں بعد عمران خان کسی فلمی اسائمینٹ پر آسٹریلیا چلا گیا۔ دونوں کے تعلقات کی فائل بند ہوگئی اور پروین نے دوبارہ کسی اور مرد کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہیں جوڑا۔

وہ جب گریجویٹ ہوئی تو اس کی دلچسپی انگریزی ادب کے ساتھ تھی لیکن وہ دن بہت جلد گزر گئے اور اس کی فطرت میں نیا تیور جاگا، اب وہ زندگی میں ہلچل مچانا چاہتی تھی۔ اس نے ایک اشتہاری ایجنسی ERA میں نوکری کرلی۔ اسکول میں وہ ہمیشہ ڈرائنگ میں فرسٹ آتی تھی اور اب وہ ایک کامیاب ڈیزائنر بن گئی تھی۔

موبائیل بجنے لگا۔

پروین تخیلات سے نکل کر حقیقی دنیا میں آ گئی۔ اس نے سر اٹھایا۔

''ہلو......ہلو......

''یس سر!''

''شانتابائی......''

''رانگ نمبر......''

''اس نے موبائیل آف کر دیا۔

رسالے کی ورق گردانی کرتے ہوئے وہ سوچنے لگی.......... جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو سارا آسمان اس کا ہوتا ہے لیکن جب وہ باشعور ہوتا ہے تو اس کے لئے کٹا ہوا آسمان ہی بچتا ہے۔ کیا یہ آسمان پرواز کے لئے کافی ہے؟ کیا اتنے محدود آسمان کی خواہش اس نے کی تھی؟

ان سوالوں کے جواب میں بحرِ عرب کی مشتعل لہریں ساحل پر سر پٹکنے لگیں۔

پروین نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دو بج کر تیس منٹ ہو چکے تھے۔ وقت کافی گزر گیا تھا مگر وہ کام کے موڈ میں نہیں تھی۔ وہ کرسی پر پھیل پر دراز ہوگئی۔ آنکھیں موند لیں۔ اس کے پاس مستقبل کے کچھ پلان تھے۔ وہ دنیا کی سیر کرنا چاہتی تھی، دنیا کی حیرتوں کے روبرو جانا چاہتی تھی، اچھلنا کودنا اور زندہ رہنے کا مکمل احساس پانا چاہتی تھی۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ کسی چٹان کی تہہ میں چلی جائے اور وہیں مر کھپ جائے! مصروفیات کے سبب اس کا اپنے دوستوں اور سہیلیوں سے رابطہ ٹوٹ چکا تھا،

زندگی ایک بوجھ سی لگنے لگی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی۔ یہ تبدیلی اچانک کیسے آئی؟

اس کی پلکیں اب بھی بند تھیں۔

چارج کر دس منٹ۔

کانفرنس روم میں میٹنگ کا اعلان صبح ہی ہو چکا تھا۔

حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے مسز بھروچا نے کہا:

''آپ سب کے یہاں جمع ہونے کی میں شکر گزار ہوں اور میٹنگ کے مقصد سے آپ لوگوں کو آگاہ کرتی ہوں، ہم نے ایک بڑی رقم پر مشتمل لین دین کا سودا طے کیا ہے۔ نیلم ایئر کنڈیشنر نے بالآخر فیصلہ کر ہی لیا اور انہوں نے ہماری ایجنسی کو پبلسٹی کے لئے منتخب کر لیا ہے۔''

تالیوں کی گونج کے دوران مسز بھروچا نے کہا:

''میں ضروری سمجھتی ہوں کہ اس کامیابی کا کریڈٹ اس شخصیت کو دوں جو اس کی ذمہ دار ہے، اس کا اعزاز میں مس پروین کو دیتی ہوں جن کے Concepts کو بے مثال پایا گیا ہے، لیکن مجھے اقرار کرنا چاہئے کہ میں ان کے حق میں سو فیصدی نہیں تھی۔'' وہ ہنس پڑی۔

پروین حیرت زدہ تھی، اس نے سر اٹھائی۔

مسز بھروچا نے کہا:

''میں چاہتی ہوں مس پروین اس کام کو سوپروائز کرے۔''

پروین خاموش تھی۔ اس کے لئے یہ وہ سنہری موقع تھا جس کی وہ منتظر تھی۔

اس نے کہا:

''میڈم میں اس آفر کے لئے آپ کی شکر گزار ہوں۔''

وہ جب کانفرنس ہال سے باہر آئی تو مسکرا رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ آسمان کٹا ہوا نہیں بلکہ مکمل ہے، لامحدود۔

اس نے سوچا کہ اب خوشیاں منانے وہ کہاں جائے......؟

وہ خراماں خراماں چلتے ہوئے سمندر سے لگے فٹ پاتھ پر آ گئی۔ ایک مونگ پھلی بیچنے والے

سے اس نے نمکین مونگ پھلی کے دانے خریدے اور اس طول طویل دیوار کی منڈیر پر جا بیٹھی جو سمندر کو آبادی سے جدا کرتی تھی۔ وہاں بیٹھ کر اس نے مونگ پھلی کا پوڑا کھولا اور بڑی بے اعتنائی سے مونگ پھلی کے دانے کھانے لگی۔ اس کے بالوں کی لٹیں ہوا کے زور سے اڑی جا رہی تھیں اور آنکھوں میں آنسو خاموشی سے بہہ رہے تھے۔

☆☆☆

ناز :

''خوبصورتی پر ناز تھا، ناک پر مکھی تک بیٹھنے نہیں دیتی تھی، آج جسم پر بے شمار مکھیاں بھنبھناتی ہیں!''

یک سطری کہانی - ع.ع.خ

... Aur Bijuka Nanga Ho Gaya!

(Collection of Urdu Short Stories)

by : Abdul Aziz Khan

Courtesy : *The Indian* EXPRESS
MUMBAINewsline ■ June-2,2004

Illustration: Shantanu Mitra

بہ شکریہ دی سنڈے انڈین۔ سینئر السٹریٹر: شانتانو مترا
کی تصویر صفحہ ۴۴ پر "بجوکا ننگا ہو گیا!"
۳۰ مارچ ۲۰۰۸ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔